اچھی کتابیں، کم قیمت

بغیر اجازت

سعادت حسن منٹو

بزم ادب لائبریری

2.50

ظفر احمد قریشی اینڈ سنز لاہور

بغیر اجازت

سعادت حسن منٹو

ظفر برادرز
۴- عبدالکریم روڈ۔ لاہور
دی مال۔ مری

جملہ حقوق دائمی بحق مکتبہ ظفر برادرز محفوظ ہیں

ہندوستان میں جناب محمد عثمان صدیقی دہلوی کے پاس محفوظ ہیں۔

بار اوّل ——— ۱۹۵۵ء

بار دوم ——— ۱۹۶۷ء

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— دو روپے پچاس پیسے

پرنٹر ——— ظفر احمد قریشی

مطبوعہ ——— اشرف پریس لاہور

کتابت ——— محمد اسحاق شاہین

سول ایجنٹس

عرفان پبلشرز۔ صدر بازار۔ لاہور کینٹ

فہرست

سونے کی انگوٹھی ۵
ٹانگے والے کا بھائی
مسٹر حمیدہ
بغیر اجازت
قدرت کا اصول
خوشبودار تیل
سنتر پنچ
جسم اور روح
اب اور کہنے کی ضرورت نہیں
ٹیٹوال کا کشمیری
رشوت
قیمے کی بجائے بوٹیاں

۵

کرنل دانا

سونے کی انگوٹھی

"چھنے کا چھنا ہو گیا آپ کے سر پر ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بال نہ کٹوانا کہاں کا فیشن ہے۔"

"فیشن ویشن کچھ نہیں ـــــ تمہیں اگر بال کٹوانا پڑیں تو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔"

"میں کیوں بال کٹواؤں؟"

"کیا عورتیں کٹواتی نہیں؟" ـــــ ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسی موجود ہیں جو اپنے بال کٹواتی ہیں ـــــ بلکہ اب تو یہ فیشن بھی چل نکلا ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بال رکھتی ہیں۔"

"لعنت ہے اُن پر۔"

"کس کی؟"

"خدا کی، اور کس کی؟ ـــــ بال تو عورت کی زینت ہیں ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں کیوں اپنے بال مردوں کی مانند بنوا لیتی ہیں ـــــ پھر پتلون میں پہنتی ہیں ـــــ نہ رہے ان کا وجود دنیا کے تختے پر۔"

"وجود تو خیر آپ کی اس بد دعا سے ان نیک بخت عورتوں کا دنیا کے اس تختے سے کسی حالت میں بھی غائب نہیں ہوگا ـــــ ویسے ایک چیز سے مجھے تم سے کلی اتفاق ہے کہ عورت کو پتلون جسے سلیکس کہتے ہیں نہیں پہننی چاہیئے ـــــ اور سگریٹ بھی نہیں پینے چاہئیں۔"

"اور آپ ہیں کہ دن میں پورا ایک ڈبہ پھونک ڈالتے ہیں۔"

"اس لئے کہ میں مرد ہوں ـــــ مجھے اس کی اجازت ہے۔"

"کس نے دی تھی یہ اجازت آپ کو؟ ـــــ میں اب آئندہ سے ہر روز صرف ایک ڈبہ منگا کر دیا کروں گی۔"

"اور وہ جو تمہاری سہیلیاں آتی ہیں اُن کو سگریٹ کہاں سے ملیں گے؟"

"وہ کب پیتی ہیں؟"

"اتنا سفید جھوٹ نہ بولا کرو ـــــ ان میں سے جب بھی کوئی آتی ہے تم میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر اندر سے لے جاتی ہو ـــــ ساتھ ہی ماچس بھی ـــــ آخر مجھے آواز دے کر تمہیں بلانا پڑتا ہے اور میرا ڈبہ مجھے واپس مل جاتا ہے۔ اس میں سے

پانچ چھ سگریٹ غائب ہوتے ہیں۔"

"پانچ چھ سگریٹ؟ ــــ جھوٹ تو آپ بول رہے ہیں ــ وہ بیچاریاں تو مشکل سے ایک سگریٹ پیتی ہیں۔"

"ایک سگریٹ پینے میں انہیں مشکل کیا محسوس ہوتی ہے؟"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی؟ ــــ آپ کو تو اور کوئی کام ہی نہیں سوائے بحث کرنے کے۔"

"ہزاروں کام ہیں ــــ تم کون سے ہل چلاتی ہو۔ سارا دن پڑی سوتی رہتی ہو۔"

"جی ہاں، آپ تو چوبیس گھنٹے جاگتے اور وظیفہ کرتے رہتے ہیں۔"

"وظیفے کی بات غلط ہے ــــ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں صرف رات کو چھ گھنٹے سوتا ہوں۔"

"اور دن کو؟"

"کبھی نہیں ــــ بس آنکھیں بند کر کے تین چار گھنٹے لیٹا رہتا ہوں کہ اس سے آدمی کو بہت آرام ملتا ہے۔ ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔"

"یہ تھکن کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کون سی مزدوری کرتے ہیں؟"

"مزدوری ہی تو کرتا ہوں ــــ صبح سویرے اٹھتا ہوں۔ اخبار پڑھتا ہوں ــــ ایک نہیں چار ــــ پھر ناشتہ کرتا ہوں، نہاتا ہوں اور پھر تمہاری روزمرہ کی چخ کے لئے تیار ہو جاتا ہوں ــــ"

"یہ مزدوری ہوئی؟ اور آپ یہ تو بتائیے کہ روز مرہ کی چخ کا الزام کہاں تک درست ہے؟"

"جہاں تک اسے ہونا چاہیے — شروع شروع میں — میرا مطلب شادی کے بعد دو برس تک بڑے سکون سے زندگی گذرتی رہی تھی لیکن پھر ایک دم تم پر کوئی ایسا دورہ پڑا کہ تم نے ہر روز مجھ سے لڑنا جھگڑنا اپنا معمول بنا لیا — پتہ نہیں اس کی وجہ کیا ہے؟"

"وجہ ہی تو مردوں کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے — آپ لوگ سمجھنے کی کوشش ہی کرتے۔"

"مگر تم سمجھنے کی مہلت بھی تو دو — ہر روز کسی نہ کسی بات کا شوشہ چھوڑ دیتی ہو۔ بھلا آج کیا بات تھی جس پر تم نے اتنا چیخنا چلانا شروع کر دیا۔"

"گویا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ پچھلے چھ مہینوں سے بال نہیں کٹوائے — اپنی اچکنوں کے کالر دیکھئے — میلے چکٹ ہو رہے ہیں۔"

"ڈرائی کلین کرا لوں۔"

"پہلے اپنا آپ ڈرائی کلین کرائیے — وحشت ہوتی ہے اللہ قسم آپ کے بالوں کو دیکھ کر — جی چاہتا ہے مٹی کا تیل ڈال کر ان کو آگ لگا دوں۔"

"تاکہ میرا خاتمہ ہو جائے — لیکن مجھے تمہاری اس خواہش پر کوئی اعتراض نہیں — لاؤ باورچی خانے سے مٹی کے تیل کی بوتل — آہستہ آہستہ میرے سر میں ڈالو اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کو آگ دکھا دو۔ خس کم جہاں پاک۔"

"یہ کام آپ خود ہی کیجئے ـــــ میں نے آگ لگائی تو آپ یقیناً کہیں گے کہ تمہیں کسی کام کا سلیقہ نہیں۔"

"یہ حقیقت ہے کہ تمہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں۔ کھانا پکانا نہیں جانتیں سینا پرونا تمہیں نہیں آتا۔ گھر کی صفائی بھی تم اچھی طرح نہیں کر سکتیں۔ بچوں کی پرورش ہے، اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے ـــــ"

"جی ہاں، بچوں کی پرورش تو اب تک ماشاءاللہ آپ ہی کرتے آئے ہیں۔ میں تو بالکل نکمی ہوں۔"

میں اس معاملے میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا ـــــ تم خدا کے لئے اس بحث کو بند کرو۔"

"میں بحث کہاں کر رہی ہوں ـــــ آپ تو معمولی باتوں کو بحث کا نام دے دیتے ہیں۔"

تمہارے نزدیک یہ معمولی باتیں ہوں گی، مگر خدا کی قسم! تم نے میرا دماغ چاٹ لیا ہے۔ میرے سر پہ ہمیشہ اتنے ہی بال رہے ہیں ـــــ اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اتنی فرصت نصیب نہیں ہوتی کہ حجام کے پاس جاؤں ـــــ"

"جی ہاں ـــــ آپ کو اپنی عیاشیوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔"

"کن عیاشیوں سے؟"

"آپ کام کرتے ہیں؟ کہاں ملازم ہیں ـــــ کیا تنخواہ پاتے ہیں؟"

"ملازمت کیا ضروری ہے؟ — میں تو اس کو بہت بڑی لعنت سمجھتا ہوں۔"

"آپ کو تو ہر وہ کام بہت بڑی لعنت معلوم ہوتا ہے جس میں آپ کو محنت مشقت کرنی پڑے۔"

"میں کیا محنت مشقت نہیں کرتا؟ — ابھی پچھلے دنوں اینٹیں سپلائی کرنے کا میں نے جو ٹھیکہ لیا تھا، جانتی ہو میں نے دن رات ایک کر دیا تھا۔"

"گدھے کام کر رہے تھے، آپ تو سوتے رہے ہوں گے۔"

"گدھوں کا زمانہ گیا — لاریاں کام کر رہی تھیں۔ اور مجھے ان کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ دس کروڑ اینٹوں کا ٹھیکہ تھا۔ مجھے ساری رات جاگنا پڑتا تھا۔"

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ آپ ایک رات ہی جاگ سکیں۔"

"اب اس کا کیا علاج ہے کہ تم نے میرے متعلق ایسی غلط رائے قائم کر لی ہے — اور میں جانتا ہوں کہ تم ہزار ثبوت دینے پر بھی مجھ پر یقین نہیں کرو گی۔"

"میرا یقین آپ پر سے عرصہ ہوا، اٹھ گیا ہے — آپ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔"

"بہتاں تراشی میں تمہاری ہم پلہ اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی — میں نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"ٹھہریئے — پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی دوست کے ہاں گئے تھے۔ لیکن شام کو جب آپ نے تھوڑی سی پی، تو بہک بہک کر مجھے بتایا کہ آپ ایک ایکٹرس سے مل کر آئے ہیں۔"

"وہ ایکٹرس بھی تو اپنی دوست ہے ــــ دشمن تو نہیں ــــ میرا مطلب ہے اپنے ایک دوست کی بیوی ہے۔"

"آپ کے دوستوں کی بیویاں عموماً تو ایکٹرسیں ہوتی ہیں یا طوائفیں۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ میں نے آپ سے شادی کر لی ــــ میں ایکٹرس ہوں نہ طوائف۔"

"مجھے ایکٹرسوں اور طوائفوں سے سخت نفرت ہے ــــ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ــــ وہ عورتیں نہیں سلیٹیں ہیں جن پر کوئی بھی چند حروف یا لمبی چوڑی عبارت لکھ کر مٹا سکتا ہے۔"

"تو اس روز آپ کیوں اس ایکٹرس کے پاس گئے؟"

"میرے دوست نے بلایا ــــ میں چلا گیا ــــ اس نے ایک ایکٹرس سے جو پہلے چار شادیاں کر چکی تھی، نیا نیا بیاہ رچایا تھا۔ مجھے اس سے متعارف کرایا گیا۔"

"کیسی تھی؟"

"چار شادیوں کے بعد بھی وہ خاصی جوان دکھائی دیتی تھی ــــ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ عام کنواری لڑکیوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اچھی تھی۔"

"یہ ایکٹرسیں کس طرح خود کو چست اور جوان رکھتی ہیں۔"

"مجھے اس کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں ــــ بس اتنا سنا ہے کہ وہ اپنے جسم

اور جان کی حفاظت کرتی ہیں۔"

"میں نے تو سنا ہے بڑی بدکردار ہوتی ہیں ـــــ اوّل درجے کی فاحشہ۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے ـــــ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔"

"آپ ایسی باتوں کا جواب ہمیشہ گول کر جاتے ہیں۔"

"جب مجھے کسی خاص چیز کے متعلق کچھ علم ہی نہ ہو تو میں جواب کیا دوں ـــ میں تمہارے مزاج کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔"

"دیکھئے آپ میرے متعلق کچھ نہ کہا کیجئے ـــــ آپ ہمیشہ میری بے عزتی کرتے رہتے ہیں ـــــ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"میں نے تمہاری بے عزتی کب کی ہے؟"

"یہ بے عزتی نہیں کہ پندرہ برسوں میں آپ میرا مزاج نہیں جان سکے ـــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں مخبوط الحواس ہوں۔ نیم پاگل ہوں، جاہل ہوں۔ اجڈ ہوں۔"

"یہ تو خیر تم نہیں ہو ـــــ لیکن تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے ـــ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے میرے بالوں کی بات کس غرض سے شروع کی ـــ اس لئے کہ جب بھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو تو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے۔"

خاص بات کیا ہو گی ـــــ بس آپ سے صرف یہی کہنا تھا کہ بال اتنے

بڑھ گئے ہیں کٹوا دیجئے ـــــ حجام کی دکان یہاں سے کتنی دور ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہو گی ـــ جائیے ـــ میں پانی گرم کراتی ہوں۔"

"جاتا ہوں ـــــ میں ذرا ایک سگریٹ پی لوں۔"

"سگریٹ و گریٹ آپ نہیں پئیں گے ـــ صبح سے اب تک ـــــ ٹھہریئے میں ڈبہ دیکھ لوں ـــــ میرے اللہ ـــــ بیس سگریٹ پھونک چکے ہیں آپ ـــــ بیس!"

"یہ تو کچھ زیادہ نہ ہوئے ـــــ بارہ بجنے والے ہیں!"

"زیادہ باتیں مت کیجئے ـــــ سیدھے حجام کے پاس جائیے ـــــ اور یہ اپنے سر کا بوجھ اتروائیے۔"

"جاتا ہوں ـــــ کوئی اور کام ہو تو بتا دو۔"

"میرا کوئی کام نہیں ـــــ آپ اس بہانے سے مجھے ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا، تو میں چلا۔"

"ٹھہریئے۔"

"ٹھہر گیا۔ فرمایئے۔"

"آپ کے بٹوے میں کتنے روپے ہونگے؟"

"پانچ سو کے قریب۔"

"تو یوں کیجئے ـــــ بال کٹوانے سے پہلے انار کلی سے سونے کی ایک

انگوٹھی لے آیئے ـــــ آج میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے ـــــ دو ڈھائی سو روپے کی ہو۔"

"میری تو وہیں، انارکلی ہی میں حجامت ہو جائے گی ـــــ جاتا ہوں۔"

ٹانگے والے کا بھائی

سید غلام مرتضےٰ جیلانی میرے دوست ہیں۔ میرے ہاں اکثر آتے ہیں۔ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ کافی پڑھے لکھے ہیں

ان سے میں نے ایک روز کہا۔ "شاہ صاحب! آپ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیے۔"

شاہ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا: "منٹو صاحب۔ ـــــ میری زندگی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے ـــــــــ کون سا واقعہ آپ کو سناؤں؟"

میں نے ان سے کہا۔ "جو بھی آپ کے ذہن میں آجائے!"

شاہ صاحب مسکرائے۔ "آپ مجھے بڑا پرہیزگار آدمی سمجھتے ہوں گے

——— آپ کو معلوم نہیں، میں نے دس برس تک دن رات شراب پی ہے اور خوب کھل کھیلا ہوں۔ اب چونکہ دل اچاٹ ہو گیا ہے اس لئے میں نے یہ شغل چھوڑ رکھے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کہیں آپ نے شادی تو نہیں کر لی؟"

"حضرت میں پانچ برس سے لاہور میں ہوں۔ اگر میں نے شادی کی ہوتی تو آپ کو اس کی اطلاع مل جاتی۔"

"تو کیا آپ ابھی تک کنوارے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری۔ "چلئے ——— آپ کو ایک داستان سنا دوں ——— آپ اسے لکھ کر اپنے پیسے کھرے کر لیجئے گا۔"

"مجھے پیسے کھرے کرنے تو تھے، پھر بھی میں نے ان سے کہا۔" نہیں شاہ صاحب ——— آپ اپنی داستان سنائیے۔ دیکھئے اس کا افسانہ بنتا بھی ہے کہ نہیں ——— ویسے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں نے آپ کی داستان کو افسانے میں ڈھال لیا، تو مجھے جو معاوضہ ملے گا سب کا سب آپ کا ہو گا۔"

شاہ صاحب ہنسے۔ "چھوڑ دیار ——— میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے

ٹکڑوں کی قیمت وصول نہیں کرنا چاہتا ـــــ تم افسانہ نگار لوگ عجیب موڈ کے ہوتے ہو ـــــ داستان سن لو ـــــ باقی تم جانو ـــــ مجھے معاوضے وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔"

شاہ صاحب کے لب و لہجہ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ انہیں میری بات پسند نہیں آئی۔ اس لئے میں نے اس کے بارے میں مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی اور ان سے کہا۔ "آپ اپنی داستان بیان کرنا شروع کر دیں۔"

شاہ صاحب نے میرے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اس لئے کہ میں نے انہیں چار پانچ برس کے عرصے میں کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے کہا۔ "شاہ صاحب آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

شاہ صاحب کے ہونٹوں پر جن میں سگریٹ اٹکا ہوا تھا عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "منٹو صاحب! آپ نے اپنی زندگی میں اتنے سگریٹ نہیں پیئے ہوں گے، جتنے میں پی چکا ہوں ـــــ اور اتنی شراب بھی آپ نے ابھی تک نہیں پی ہوگی جتنی کہ میں پی چکا ہوں ـــــ آج آپ نے ایسی بات چھیڑ دی کہ خود بخود میرے ہاتھ آپ کے سگریٹ کیس کی طرف اٹھ گئے ـــــ وسکی ہے آپ کے پاس؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں ـــــ ہے!"

"تو لاؤ ـــــ ایک پٹیالہ پیگ ـــــ میں دس برس کا رکھا ہوا روزہ توڑوں۔

گا ـــــ تم نے آج ایسی باتیں کی ہیں کہ میرا سارا جسم ماضی میں چلا گیا۔"

میں نے اپنی الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی اور شاہ صاحب کے لئے ایک پٹیالہ پیگ بنا کر حاضر کر دیا۔ انہوں نے ایک ہی جرعے میں گلاس خالی کر دیا۔ آستین سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ہاں نواب کہانی سنو لیکن یہ بوتل یہاں سے غائب کر دو۔"

میں نے وہسکی کی بوتل اٹھائی اور اندر جا کر الماری میں رکھ دی۔ واپس آیا تو دیکھا شاہ صاحب دوسرا سگریٹ سلگا رہے ہیں۔

میں کرسی اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ گیا ـــــ وہ مسکرائے ـــــ لیکن یہ مسکراہٹ کچھ زخمی سی تھی۔ انہوں نے اسی زخمی مسکراہٹ سے کہنا شروع کیا۔ جو واقعہ میں اب بیان کرنے والا ہوں، آج سے قریب قریب دس برس پہلے کا ہے ـــــ ہمارا حلقۂ احباب زیادہ تر کھاتے پیتے اور کافی مالدار بندوں کا تھا ـــــ بڑے اچھے لوگ تھے ـــــ ہر روز پینے پلانے کا شغل رہتا ـــــ اس حلقے میں مجھ سے علاوہ کئی اور دوستوں کو شراب کے علاوہ عورت کی بھی ضرورت محسوس ہوا کرتی ـــــ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرتے۔ مجھ سے کہتے کہ تم بھی آؤ ـــــ مگر میں انکار کر دیتا ـــــ اپنی مرضی کے خلاف۔ میرا دل ویسے چاہتا تھا کہ کسی عورت کی قربت نصیب ہو۔"

میں نے شاہ صاحب سے کہا۔ "آپ نے شادی کیوں نہ کر لی؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا: "میں نے ـــــ سچ پوچھو تو اس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

"کیوں؟"

"لیکن کبھی خیال ہی نہ آیا۔"

"خیر آپ اپنی داستان جاری رکھیے۔"

شاہ صاحب نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں دبایا۔ "پیارے منٹو! میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کے سوا کسی اور شغل میں نہ پھنسوں۔ لیکن ان کم بختوں نے آخر ایک دن مجھے آمادہ کر ہی لیا۔ یہ طے پایا کہ کسی دلال کے ذریعے سے خوش شکل لونڈیا منگوائی جائے ـــــ ہم چار دوست فلیٹ سے باہر نکلے تو ایک ٹانگے والا جو کہ میرا واقف تھا ـــــ مجھے دیکھ کر پکار اٹھا۔ شاہ جی ـــــ شاہ جی ـــــ آؤ ـــــ آؤ ـــــ ہم چاروں دوست اس کے ٹانگے میں بیٹھ گئے ـــــ اس وقت میں پورا پورا قائل ہو چکا تھا کہ شراب کے ساتھ عورت ضرور ہونی چاہیے ـــــ چنانچہ میں نے اپنی ساری شرافت اپنی جیب میں ڈال کے اس کے کان میں کہا کہ وہ کسی لونڈیا کا بندوبست کر دے ـــــ جب اس نے یہ سنا تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں کبھی ایسی واہیات بات کروں گا۔ لیکن جب میں نے اس کے کان میں پھر کہا کہ مجھے واقعی ایک لڑکی کی اشد ضرورت ہے تو اس

نے بڑے ادب سے کہا "شاہ جی، تسیں جو حکم دیو ـــــ بندہ حاضر اے ـــــ ایسی کڑی لئے کے آواں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔"

ٹانگے والا چلا گیا اور ہم واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ شام کا وقت تھا جب وہ یہ مہم سر کرنے کے لئے گیا تھا۔ ہم دیر تک انتظار کرتے رہے طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آتے تھے۔ وہ کواری لڑکی کس قسم کی ہوگی۔ کہیں کوئی بازاری عورت تو نہ نکل آئے گی۔

ہم جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو تاش کھیلنا شروع کر دی۔ رات کے بارہ بج گئے۔ ہم مایوس ہو کر باہر نکلے تو دیکھا کہ ٹانگے والا گھوڑے کے چابک لگاتا چلا آ رہا ہے۔ پچھلی نشست پر ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی تھی، میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ٹانگے والے نے مجھ سے کہا: "شاہ جی جو مال میں لینے گیا تھا وہ وساور چلا گیا ہے ـــــ اب یہ دوسرا مال بڑی کوششوں سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔"

ـــــ میں نے اس کو پانچ روپے دیئے۔ پھر ہم چاروں دوست سوچنے لگے کہ اس برقعہ پوش عورت کو کہاں لے جائیں۔ اپنے فلیٹ میں لے جانا ٹھیک نہیں تھا اس لئے کہ ذمہ داری تھی۔ لوگ چہ مے گوئیاں کرتے۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا۔ خواہ مخواہ ایک فضیحتا ہو جاتا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے دوست رحمان کے پاس چلتے ہیں۔

رات کے ایک بجے کے قریب ہم اس برقع پوش عورت کے ہمراہ رحمان کے مکان پر پہنچے۔ بہت دیر تک دستک دینے کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ کمبل اوڑھے تھا اسے غالباً بخار تھا۔

میں نے اس کو ساری بات، دہلی زبان میں بتائی تو اس نے بھی دہلی زبان ہی میں کہا۔ "شاہ جی ——— آپ کو کیا ہو گیا ہے ——— میرا مکان حاضر ہے۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس مہینے کی بیس تاریخ کو میری شادی ہونے والی ہے، ——— میرا سالا اندر ہے ——— اس کی موجودگی میں یہ سلسلہ جو آپ چاہتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے"۔

کچھ دیر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں ——— لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس کو ڈانٹا۔ "یار تم نرے کھرے بے وقوف ہو ——— اپنے سالے کو چلتا کرو ——— ہم اتنی دور سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ کیا تم میں اتنی مروت بھی باقی نہیں رہی۔ بیس تاریخ کو تمہاری شادی آ رہی ہے۔ ٹھیک ہے ——— لیکن آج میری شادی ہے ——— یہ میری دلہن برقعہ پہنے تانگے میں بیٹھی ہے ——— تمہیں اپنے دوستوں کا کچھ تو خیال آنا چاہیے"۔

رحمان کو میری حالت پر کچھ ترس آ گیا، چنانچہ اس نے اپنے سالے کو جگایا اور اُسکو اپنے بخار کیلئے کوئی ضروری دوا لینے کے لئے باہر بھیج دیا۔ شہر میں قریب قریب

کیمسٹوں کی سب دکانیں بند تھیں۔ لیکن اس نے اپنے سائیس سے کہا "سارے شہر کی دکانیں دیکھو۔ جہاں سے بھی تمہیں یہ دوا ملے لے کر آؤ۔"

لڑکا برخوردار قسم کا تھا۔ نسخہ لے کر آنکھیں ملتا ہوا چلا گیا۔ اس غریب کو ٹانگہ بھی شاید نظر نہ آیا، جس میں برقع پوش عورت بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا کہ ہجوم ٹھیک نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں میرے دوست کیا حرکتیں کریں۔ چنانچہ میں نے ان کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ ٹانگے میں واپس چلے جائیں۔ پانچ روپے ٹانگے والے کو اور دے دیئے مگر اس نے برقع پوش سواری اتاری تو کہا۔ "حضور ——— اس کی فیس تو دیتے جایئے ———"

میں نے پوچھا۔ "کتنی ہے؟"

"پچیس روپے۔"

میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور گن کر پانچ پانچ کے پانچ نوٹ اس کے حوالے کر دیئے اور اس برقع پوش عورت کو اپنے دوست کے مکان میں لے آیا۔

رحمان کو بخار تھا۔ وہ علیحدہ کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ میں بہت دیر تک اس برقع پوش عورت سے گفتگو کرتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ اپنے چہرے سے نقاب ہی ہٹایا۔

میں تنگ آیا۔ اس کو ٹٹولا تو وہ بالکل سپاٹ تھی۔ آخر میں نے زبردستی اس کا برقع الٹ دیا ——— میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب

دیکھا کہ وہ عورت نہیں ـــــ ہیجڑہ تھا ـــــ نہایت مکروہ قسم کا، مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ کیا واہیات پن ہے؟"

اس ہیجڑے نے جس کے چہرے پر بالوں کا نیلا نیلا غبار موجود تھا۔ بڑے نسوانی انداز میں جواب دیا۔ "میں ـــــ میں ٹانگے والے کا بھائی ہوں"۔

شاہ صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا "منٹو صاحب! اس دن کے بعد مجھے اس سلسلے سے کوئی رغبت نہیں رہی"۔

مسز حمیدہ

رشید نے پہلی مرتبہ اس کو بس اسٹینڈ پر دیکھا، وہ شیڈ کے نیچے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ رشید نے جب اسے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے حیرت میں گم ہو گیا۔ اس سے قبل اس نے ایسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ جس کے چہرے پر مردوں کی مانند ڈاڑھی اور مونچھیں ہوں۔

پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اس کی نگاہوں نے غلطی کی ہے، عورت کے چہرے پر بال کیسے اُگ سکتے ہیں۔ پر جب میں نے غور سے دیکھا تو اس لڑکی نے باقاعدہ شیو کر رکھی تھی، اور سرمئی غبار اس کے گالوں اور ہونٹوں پر موجود تھا۔

رشید نے سمجھا کہ شاید ہیجڑہ ہو۔ مگر نہیں، وہ ہیجڑہ نہیں تھی۔ اس لئے

اس میں ہیجڑوں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے، وہ مکمل عورت تھی۔ ناک نقشہ بہت اچھا تھا، کولہے چوڑے، چکلے ـــــ کمر پتلی ـــــ سینہ جوانی سے بھرپور ـــــ بازو سڈول ـــــ غرضیکہ اس کے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ نمونہ تھا۔

ایک صرف اس کی داڑھی اور مونچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا ـــ رشید سوچنے لگا، قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان خوبصورت لڑکی کو بدنما بنا دیا۔

رشید کے دماغ میں کئی خیالات اوپر تلے آئے اور وہ بوکھلا گیا۔

وہ سوچتا تھا۔ "کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی؟"

"صبح اٹھ کر جب اسے اُسترہ پکڑ کر شیو کرنا پڑتی ہوگی تو اسے کیا محسوس ہوتا ہوگا؟ ـــــ کیا اس وقت اس کے جی میں جھنجھلا کر یہ انتقامی خواہش پیدا نہ ہوتی ہوگی کہ وہ گھس کھدے کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے"۔

"ایک عورت کے لئے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خارپشت کی مانند اس کے گالوں پر دوسرے روز نوکیلے بال اُگ آئیں"۔

اگر مردوں کی مانند عورتوں کے بھی ڈاڑھی مونچھ اُگتی تو کوئی حرج نہیں تھا ـــــ پر یہاں ازل سے عورتوں کو ان بالوں سے بے نیاز ہی رکھا گیا ہے"۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں، عورتوں کے چہرے پر بالوں کا سونا کوئی معیوب

چیز نہیں ـــــ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ یہ دیکھنے کے عادی نہیں۔"

"صنفِ نازک آخر صنفِ نازک ہے ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جوہر موجود ہیں ـــــ پر یہ داڑھی مونچھ کس لئے اُگ آئی ہے ـــــ نظر بٹو کے طور پر؟ ـــــ اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیے ـــــ بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈا بنا دینا ـــــ یہ کہاں کی شرافت ہے؟"

"اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا۔ جو ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر استرہ ہاتھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو۔"

اگر یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور بڑھا لے تو کیا اس سے خوف نہیں آئے گا ـــــ آپ بیہوش نہ ہوں، لیکن چند لمحات کے لئے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے ـــــ آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے۔ جہاں مونچھیں مُنڈی ہوں گی، مگر آپ کی صنفِ مقابل مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہو گی۔"

بس آ گئی، وہ لڑکی اس میں سوار ہو کر چلی گئی۔ رشید کو بھی اسی بس سے جانا تھا لیکن وہ اپنے خیالوں میں اسقدر غرق تھا کہ اس کو بس کی آمد کا پتہ چلا نہ اس کے جانے کا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اس لڑکی کو ایک نظر اور دیکھنے کے لئے

پلٹا تو وہ موجود نہیں تھی ـــــ اس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس نے مزید سوچ وچار شروع کر دی۔

اس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا ـــ بار بار وہ قدرت کی بے رحمی پر لعنتیں بھیجتا تھا کہ اس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنا کر اس پر سیاہی کا لیپ کر دیا ـــــ آخر اس میں کیا مصلحت تھی؟ ـــــ اب اس شکل میں اس سے شادی کون کرے گا؟ ـــــ قدرت نے کیا اس کے لئے کوئی ایسا مرد پیدا کر رکھا ہے جو اسے قبول کرے گا؟ ـــــ لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں ہو سکتی۔

اس کی بہن آئی، دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے رشید سے کہا۔ "بھائی جان! چلئے کھانا کھا لیجئے۔"

رشید نے اس کی طرف غور سے دیکھا، اور اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر بھی بال ہیں۔ "سلیمہ ـــــ؟"

"جی۔"

"کچھ نہیں ـــــ لیکن نہیں۔ ٹھہرو ـــــ کیا تمہاری مونچھیں ہیں؟"

سلیمہ جھینپ گئی۔ "جی ہاں ـــــ بال اُگتے ہیں۔"

رشید نے اس سے پوچھا۔ "تو ـــــ میرا مطلب ہے تمہیں الجھن

نہیں ہوتی ان بالوں سے؟"

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا۔" ہوتی ہے بھائی جان۔"

"تو انہیں تم صاف کیسے کرتی ہو ــــ بلیڈ سے؟"

"جی نہیں، ایک چیز ہے جسے بے بی ٹچ کہتے ہیں ــــ اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسانا پڑتا ہے۔"

"تو بال اڑ جاتے ہیں؟"

"اڑتے وڑتے خاک بھی نہیں ــــ دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں ــــ بڑی مصیبت ہے ــــ بعض اوقات تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔"

رشید نے پوچھا۔" وہ کیوں؟"

سلیمہ نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔ تکلیف ہوتی ہے بہت ــ جب بال اکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں ــــ اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے ــــ معلوم نہیں اللہ میاں مجھ سے کن جنموں کی سزا لے رہا ہے۔"

رشید نے تھوڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا۔" تمہاری کسی اور سہیلی کے بھی داڑھی اور مونچھیں ہیں؟"

"مونچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں، پر داڑھی میں نے کبھی کسی عورت

کے چہرے پر نہیں دیکھی —— ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں جو وہ موچنے یا ہاتھ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں —— یہ آپ نے کیسی گفتگو شروع کر دی —— چلئے، کھانا کھائیے۔"

رشید نے کچھ دیر سوچا۔ "نہیں —— میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میرا معدہ ٹھیک نہیں"

رشید کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی پڈنگ کھائی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی —— اس کے سارے جسم پر تیز تیز نوکیلے یوں رینگ رہے تھے جیسے خاردار چیونٹیاں۔

جب سلیمہ چلی گئی تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا —— لیکن سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کے بال تو دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس امر کا رشید کو کامل احساس تھا، لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمہ حل کر رہا ہے۔

رشید کو داخلے کی درخواست دینا تھی۔ اس نے بی اے کا امتحان راولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور میں کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلا جائے، جہاں اس کے والد پریوی کونسل میں پریکٹس کرتے تھے۔

اس روز وہ مونچھوں اور ڈاڑھی والی اسی لڑکی کے باعث نہ جا سکا۔ دوسرے

روز وہ بس کے بجائے ٹانگے میں گیا۔ اس نے چونکہ بی۔ اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا تھا، اس لئے اسے داخلے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ وہ ڈاڑھی مونچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو چکی تھی، لیکن ایک دن اس نے اس کو کالج میں دیکھا۔ لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

ایک نے آواز کسا۔ "مسٹر حمیدہ"۔

دوسرے نے کہا۔ "ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں ـــــ عورت کی عورت اور مرد کا مرد!"

تیسرے نے قہقہہ لگایا۔ "عجائب گھر میں رکھنا چاہیئے تھا ایسی شخصیت کو"۔

اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی ـــــ اس کی پیشانی پسینے سے تر بتر تھی ـــــ رشید کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر پھوڑ دوں جو اس کا مذاق اڑا رہے تھے مگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہا ـــــ جب لڑکے چلے گئے اور اس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسو خشک کئے تو وہ جرأت سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملائم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ "آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟"

اس نے تنگ آ کر کہا۔ "کیا آپ بھی میرا مذاق اڑانے آئے ہیں"
رشید نے اپنا لہجہ اور بھی ملائم کر دیا۔ "جی نہیں ——— آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجئے۔"

اس نے جس کا نام حمیدہ تھا، نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔ "مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں۔"

"یہ آپ کی زیادتی ہے ——— ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے ——— میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں اور زیادہ مضطرب کروں ——— ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجئے۔"

یہ کہہ کر رشید چلا گیا۔

اس کے بعد متعدد مرتبہ اس نے حمیدہ کو دیکھا جو بی۔ اے میں پڑھتی تھی۔ سارے کالج میں اس کی داڑھی مونچھوں کے چرچے تھے ——— لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بال نہیں ہے۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئی۔ اُسے پندرہ دن تک بستر میں لیٹنا پڑا۔ رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اس کی بیمار پرسی کے

لئے جائے۔ مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے گی، کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہ تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتی ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہے، اسے اس کے سوا اور کوئی کھینے والا نہ ہو ——— لیکن ایک دن مجبور ہو کر اس نے چپڑاسی کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا، جس میں چند یہ الفاظ مرقوم تھے۔

"رشید صاحب!

میں بیمار ہوں ——— کیا آپ چند لمحات کے لئے میرے کمرے میں تشریف لا سکتے ہیں۔ ممنون و متشکر ہوں گی۔

حمیدہ"

رشید یہ رقعہ ملتے ہی ہوسٹل میں گیا۔ بڑی مشکلوں سے حمیدہ کا کمرہ تلاش کیا۔ اندر داخل ہوا تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی۔ کمبل اوڑھے لیٹا ہے، مگر اس نے اپنا ردِ عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔

چارپائی کے ساتھ ہی کرسی پڑی تھی، رشید اس پر بیٹھ گیا۔

حمیدہ مسکرائی۔ "میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے بخار کے باعث سخت نقاہت ہو گئی ہے اور شیو نہیں کر سکی ——— کیا آپ میرے لئے یہ زحمت برداشت کر سکیں گے؟"

رشید نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا ——— شیو کا سامان کھڑکی کی

سل پر موجود تھا۔ ٹین سے گرم پانی لا کر اس نے حمیدہ کے چہرے کے بال نرم کئے۔ صابن سے اچھی طرح جھاگ پیدا کئے اور پانچ منٹ کے اندر اندر شیو بنا ڈالی۔ پھر تولیے سے اس کا چہرہ خشک کیا اور شیو کا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں رکھ دیا۔ جہاں سے اس نے اٹھایا تھا۔

حمیدہ نے اپنا نحیف ہاتھ گالوں پر پھیرا اور رشید سے کہا:

"شکریہ"

اب دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ رشید نے ایم۔ اے اور حمیدہ نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ رشید کو فوراً بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ اب وہ ایک نہیں دو شیو روزانہ بناتا تھا۔

بغیر اجازت

نعیم ٹہلتا ٹہلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔ اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔ گھاس کے ایک تختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی:۔

"کیسی پُر فضا جگہ ہے ـــــ حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے اوجھل رہی ـــــ نظریں ـــــ اوجھل ـــــ"

اتنا کہہ کر وہ مسکرایا۔ "نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں ـــــ آہ کہ نظر کی یہ بے نظری!

دیر تک وہ گھاس کے اس تختے پر لیٹا اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا۔ لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔ "یہ نرم نرم گھاس کتنی فرحت افزا ہے ـــــ آنکھیں پاؤں کے تلوؤں میں چلی آئیں ـــــ اور یہ پھول ـــــ

یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہرجائی خوشبو ہے۔ ہر شے جو ہرجائی ہو خوبصورت ہوتی ہے، ہرجائی عورت، ہرجائی مرد ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئیں یا خوبصورت خیال ——— ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر دل خوبصورت نہیں ہوتا ——— مثال کے طور پر یہ پھول ——— اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی۔ یہ اس ٹہنی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے ——— بہرحال یہ جگہ خوب ہے۔ ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے ——— روشنی بھی ہے ——— سائے بھی ہیں ——— ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے۔ یہ پر فضا جگہ جو اتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہی۔"

اس کے بعد نعیم فرطِ مسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے کہ اچانک موٹر کے ہارن کی کرخت آواز اس کے سازِ دل کے سارے تار جھنجھوڑ دیتی ہے۔ وہ چونک کر اٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک موٹر پاس کی سڑک پر کھڑی ہے اور ایک لمبی لمبی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس مونچھوں والے آدمی نے گرج کر کہا۔ "اے تم کون ہے؟"

نعیم جو اپنے نشے میں سرشار تھا چونکا۔ "یہ موٹر اس باغ میں کہاں سے آگئی؟"

مونچھوں والا جو اس باغ کا مالک تھا بڑبڑایا۔ "دفع قطع سے تو آدمی

شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا ـــــــ کس اطمینان سے لیٹا تھا جیسے اس کے باوا کا باغ ہے۔" پھر اس نے بلند آواز میں للکار کے نعیم سے کہا۔ "اماں کچھ سنتے ہو؟"

نعیم نے جواب دیا۔ "حضور سن رہا ہوں ـــــــ تشریف لے آیئے، یہاں بہت پرفضا جگہ ہے۔"

باغ کا مالک بھنا گیا۔ "تشریف کا بچہ ـــــــ اِدھر آؤ۔"

نعیم لیٹ گیا۔ "بھئی مجھ سے نہ آیا جائیگا۔ تم خود ہی چلے آؤ۔ واللہ بڑی دلفریب جگہ ہے، تمہاری سب کوفت دور ہو جائیگی۔"

باغ کا مالک موٹر سے نکلا اور غصے میں بھرا نعیم کے پاس آیا۔

"اٹھو یہاں سے۔"

نعیم کے کانوں کو اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گذری۔ "اتنے اونچے نہ بولو ـــــ آؤ، یہاں میرے پاس لیٹ جاؤ، بالکل خاموش، جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں، آنکھیں بند کر لو، اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو، دماغ کی ساری بتیاں گل کر دو۔ پھر جب تم اس اندھیرے میں چلے گے تو ٹٹولتی ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے قمقمے روشن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل غافل تھے ـــــــ آؤ، میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔"

باغ کے مالک نے ایک لحظہ سوچا اور نعیم سے کہا۔ "دیوانے معلوم

ہوتے ہو۔"

نعیم مسکرایا۔"نہیں ——— تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں۔ میری جگہ اگر کوئی یہاں دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹہنیوں پہ بچوں کے گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا ——— دیوانگی اطمینان کا نام نہیں میرے دوست ——— لیکن آؤ ہم دیوانگی کی باتیں کریں۔"

"بکواس بند کرو ——— نکل جاؤ یہاں سے۔"

باغ کے مالک کو طیش آ گیا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور کہا کہ نعیم کو دھکے مار کر باہر نکال دے۔

"ارے تم کون ہو ——— بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو۔"

جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا۔ جس پہ یہ لکھا تھا۔"بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔ وہ مسکرایا۔" حیرت ہے کہ یہ میری نظروں سے اوجھل رہا۔ نظر ہو تو بعض چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔ آہ، نظر کی یہ بے نظری۔"

یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹس کی نمائش میں چلا گیا۔ تاکہ اپنا ذہنی تکدر دور کر سکے۔

ہال میں داخل ہوتے ہی اس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔

ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا۔" مسز فوجدار، یہ پینٹنگ

دیکھی آپ نے؟"

مسز نوجدا نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور اس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا کہا۔ "تم نے دیکھا ـــــ شیریں کتنی سج بن کے آئی ہے۔"

ایک نوجوان عورت ایک نوعمر لڑکی سے کہہ رہی تھی۔ "ثریا ادھر آ کے تصویریں دیکھ ـــــ تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟"

ثریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اصل میں اس کو ایک بوائے فرینڈ سے ملنا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر کا مرد جسے پینٹنگز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اپنے ادھیڑ عمر کے دوست سے کہہ رہا تھا۔ "بلّی زکام کی وجہ سے نڈھال ہے، ورنہ ضرور آتی۔ آپ جانتے ہی ہیں پینٹنگز سے اسے کتنی دلچسپی ہے۔ اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنا لیتی ہے۔ پرسوں اس نے پنسل کاغذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر اتاری ـــــ میں تو دنگ رہ گیا۔"

نعیم پاس کھڑا تھا۔ اس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا۔ "ہو بہو سائیکل معلوم ہوتی ہوگی۔"

دونوں دوست بھونچکے سے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بدتمیز ہے چنانچہ ان میں سے ایک نے نعیم سے پوچھا:۔

"آپ کون ہیں؟"

نعیم بوکھلا سا گیا۔ "میں ـــــ میں!"

"میں میں کیا کرتے ہو ـــــ بتاؤ تم کون ہو؟"

نعیم نے سنبھل کر کہا۔ "آپ ذرا آرام سے پوچھئے ـــــ میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔"

"تم یہاں آئے کیسے؟"

نعیم کا جواب بڑا مختصر تھا۔ "جی پیدل۔"

عورتیں اور مرد جو آس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کے بجائے خدا معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے، ہنسنا شروع کر دیا ـــــ اتنے میں نمائش کا ناظم آیا۔ اس کو جب نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو اس نے بڑے کڑے انداز میں اس سے پوچھا۔ "تمہارے پاس کارڈ ہے؟"

نعیم نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا۔ "کارڈ ـــــ کیسا کارڈ، پوسٹ کارڈ؟"

ناظم نے اپنا لہجہ اور کڑا کر کے نعیم سے کہا۔ "بغیر اجازت تم اندر چلے آئے، جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

نعیم ایک تصویر کو دیر تک دیکھنا چاہتا تھا، مگر اسے بادلِ ناخواستہ وہاں سے نکلنا پڑا۔ سیدھا اپنے گھر گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اسکا نوکر خفلو باہر

نکلا۔ نعیم نے اس سے درخواست کی۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

فضلو بوکھلا گیا۔ "حضور ——— حضور ——— یہ آپ کا اپنا گھر ہے اجازت کیسی؟"

نعیم نے اس سے کہا۔ "نہیں فضلو، یہ میرا گھر نہیں ——— یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے، کیسے میرا ہو سکتا ہے، مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔"

فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "کیا سرکار؟"

نعیم نے کہا۔ "یہی کہ یہ گھر میرا نہیں۔ البتہ اس کا گرد و غبار، اس کی تمام غلاظتیں میری ہیں ——— وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت ہوتی ہے، میری ہیں۔ لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی ہیں ——— خدا جانے کس کی ——— اب میں ڈرتا ہوں۔ کسی اچھی چیز کو اپناتے خوف لگتا ہے۔ ——— یہ پانی میرا نہیں ——— یہ ہوا میری نہیں ——— یہ آسمان میرا نہیں۔ ——— وہ لحاف جو میں سردیوں میں اوڑھتا ہوں میرا نہیں ——— اس لئے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا ——— فضلو، جاؤ تم بھی میرے نہیں ———"

نعیم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی، وہ چلا گیا۔

رات کے دس بج چکے تھے ——— ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے سے "پیا بن ناہیں آوت چین" کے بول باہر اڑ اڑ کے آرہے تھے۔

نعیم اس کوٹھے پر چلا گیا۔ اندر مجرا سننے والے تین چار مردوں کی طرف

دیکھا اور طوائف سے کہا "ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

طوائف مسکرائی انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے ـــــ ادھر مسند پر بیٹھئے ـــــ گاؤ تکیہ لے لیجئے۔"

نعیم بیٹھ گیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا۔ "یہ کتنی اچھی جگہ ہے۔"

طوائف سنجیدہ ہوگئی۔ "آپ کیا مذاق اڑانے آئے ہیں ـــــ یہ اچھی جگہ ہے۔ جسے تمام شرفا حد سے زیادہ گندی جگہ سمجھتے ہیں ـــــ"

نعیم نے اس سے کہا۔ "یہ اچھی جگہ اس لئے ہے کہ یہاں "بغیر اجازت کے اندر آنا منع ہے۔" کا بورڈ آویزاں نہیں ہے۔"

یہ سن کر طوائف اور اس کا مجرا سننے والے تماشبین ہنسنے لگے ـــــ نعیم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جس کا مجرا سننے کے لئے اس قسم کے چغد آتے ہیں۔

قدرت کا اصول

قدرت کا یہ اصول ہے کہ جس چیز کی مانگ نہ رہے، وہ خود بخود یا تو رفتہ رفتہ بالکل نابود ہو جاتی ہے یا بہت کم یاب، اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے سوچیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں سے کتنی اجناس غائب ہو گئی ہیں۔

اجناس کو چھوڑیئے، فیشن لے لیجئے۔ کئی آئے اور کئی دفن ہو گئے۔ معلوم نہیں کہاں؟ دنیا کا یہ چکر بہر صورت اسی طریقے سے چلتا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ لڑکیاں انگیا کا استعمال بہت معیوب سمجھتی تھیں مگر اب یہ بہت ضروری سمجھا جاتا ہے کہ سہارا ہے۔ امریکہ اور انگلستان سے طرح طرح کی انگیاں آ رہی ہیں ——— کچھ ایسی ہیں کہ ان میں کوئی اسٹریپ نہیں

ہوتا۔ ایک انگیا جو سب سے قیمتی ہے "میڈن فورم" کہلاتی ہے، اسے کوئی بڑھیا بھی پہن لے تو جوان دکھائی دیتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ شدید انگیا نور جہاں فلم ایکٹرس نے "چن وے" میں پہنی تھی جن کی نمائش سے میرے جمالیاتی ذوق کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ مگر میں کیا کرتا، ہر شخص کو اپنی پسند کی چیز کھانے اور پہننے کی آزادی ہے۔

"تنوع انسان کی فطرت ہے ——— وہ کبھی ایک چیز پر قائم نہیں رہتا، اسی لئے اس کے گرد و پیش کا ماحول بدلتا رہتا ہے۔ اگر آج اسے مرغیاں مرغوب ہیں تو مارکیٹ میں لاکھوں مرغیاں ایک دم آجائینگی ——— لیکن جب اس کا دل ان سے اُکتا جائے گا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں، کہ مرغیاں یا تو انڈے دینا بند کر دیں گی یا انہیں سیں کی نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اگر لوگ پانی پینا بند کر دیں تو سارے کنوئیں خشک ہو جائیں۔ دریا اپنے کو بیکار سمجھ کر اپنا رخ بدل لیں۔

میں آج سے پندرہ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں ——— آرگنڈی (جسے مدقل بھی کہا جاتا تھا) کی بنی بنائی قمیضوں کا رواج عورتوں میں عام تھا ——— لیکن دو تین برسوں کے بعد یہ قمیضیں ایسی غائب ہوئیں، جیسے گدھے کے سر سے سینگ ——— اتنے برس گذر چکے ہیں، مگر اب یہ کپڑا جو حیوانوں کی کھال کے مانند اکڑا ہوتا تھا کسی عورت کے بدن پر نظر نہیں آیا ——— ظاہر ہے

کہ اس کا بنانا یا تو یکسر بند کر دیا گیا ہے ـــــ یا بہت کم مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔

میں اب اصل موضوع کی طرف آتا ہوں، زیادہ عرصہ نہیں گذرا ـــ ہم جنسیت کا بازار پنجاب میں ہر جگہ گرم تھا۔ مردوں کی اکثریت اس غیر فطری فعل سے شغل فرماتی تھی۔ اور ایسے لڑکے بہ افراط موجود تھے جن کی ادائیں دیکھ کر نوخیز لڑکیاں بھی شرمائیں ـــــ ان کی چال ڈھال کچھ ایسی قیامت خیز ہوتی تھی کہ تعیش پسند مرد اپنی عورتوں کو بھول جاتے تھے۔

میں اسی زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، جب لڑکیوں کے بدلے ان کی مخالف جنس کا دور دورہ تھا ـــــ میں اپنے مکان کی بیٹھک میں اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا کہ باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں ایسا معلوم ہوتا تھا، کوئی بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔

امرت سر میں ہنگامے برپا ہونا ان دنوں معمولی بات تھی ـــــ میں نے سوچا کہ ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ لیکن اپنے اندیشے کا ذکر ہندو دوست سے نہ کیا جو میرا ہم جماعت تھا۔

ہم دونوں گلی سے باہر نکلے ـــــ دیکھا کہ بازار میں سب دکانیں بند ہیں بڑی حیرت ہوئی کہ ماجرا کیا ہے؟ ـــــ ہم گلی کے باہر کھڑے تھے کہ اتنے میں شہر کا ایک بہت بڑا غنڈہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی، خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ اس لئے کہ وہ مجھے پہچانتا تھا کہ میں ایک

ذی اثر آدمی کا بیٹا ہوں۔ سلام کرنے کے بعد اس نے میرے دوست کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میاں صاحب ـــــ بابو جی سے کہیئے کہ یہاں کھڑے نہ رہیں ـــــ آپ انہیں اپنے مکان میں لے جائیں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ جو خون خرابہ ہوا۔ اس کا باعث میرا دوست تھا۔ اس کے کئی طالب تھے ـــــ وہ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ جن میں اس کی وجہ سے لڑائی ہوئی، جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے ـــــ شہر کا جو سب سے بڑا غنڈہ تھا، چوتھے پانچویں روز اسے دوسری پارٹی نے اس قدر زخمی کر دیا کہ دس دن اسے ہسپتال میں رہنا پڑا ـــــ جو اس کی غنڈہ گردی کا صحیح سے بڑا ریکارڈ تھا۔

اہلِ لاہور اچھی طرح جانتے ہوں گے، کہ یہاں ایک لڑکا "ٹینی سنگھ" کے نام سے مشہور تھا۔ جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کے ایک پرستار نے اسے ایک بہت بڑی موٹر کار دے رکھی تھی۔ وہ اس میں بڑے ٹھاٹھ سے آتا۔ اور دوسرے لڑکے جو اسی کے زمرے میں آتے تھے۔ بہت جلتے تھے۔ مگر لاہور میں اس وقت، "ٹینی سنگھ" ہی کا طوطی بولتا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا، واقعی خوبصورت تھا۔

اب یہ حال ہے کہ کوئی ٹینی سنگھ نظر نہیں آتا، کالجوں میں چلے جایئے، وہاں آپ کو ایسا کوئی لڑکا نظر نہیں آئے گا جس میں انسانیت کے خلاف کوئی چیلنج ہو۔ اس لئے کہ اب ان کی جگہ لڑکیوں نے لے لی ہے۔ قدرت نے ان کی اننا کر دی۔

خوشبودار تیل

"آپ کا مزاج اب کیسا ہے!"

"یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو ـــــ اچھا بھلا ہوں ـــــ مجھے کیا تکلیف تھی؟"

"تکلیف تو آپ کو کبھی نہیں ہوتی ـــــ ایک فقط میں ہوں جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف یا عارضہ چمٹا نہ رہتا ہو۔"

"یہ تمہاری بد احتیاطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے ـــــ ورنہ آدمی کو کم از کم سال بھر میں دس مہینے تو تندرست رہنا چاہیئے۔"

"آپ تو بارہ مہینے تندرست رہتے ہیں ـــــ ابھی پچھلے دنوں دو مہینے ہسپتال میں رہے ـــــ میرا خیال ہے اب پھر آپ کا وہیں جانے کا ارادہ ہے۔"

"ہسپتال میں جانے کا ارادہ کون کرتا ہے؟"

"آپ ایسے آدمی، اور کس کا دماغ پھرا ہے کہ وہ بیمار ہو کر وہاں جائے اور اپنے عزیزوں کی جان کا عذاب بن جائے۔"

"تو گویا، میں اپنے سب رشتہ داروں کی جان کا عذاب بنا بیٹھا ہوں ——— میرا تو یہ نظریہ ہے کہ ہر رشتے دار خود جان کا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔"

"آپ کو تو رشتہ داروں کی کوئی پرواہ نہیں ——— حالانکہ وہی ہمیشہ آپ کے آڑے وقت میں کام آتے رہے ہیں۔"

"کون سے آڑے وقت میں کام آتے رہتے ہیں۔"

"پچھلے برس جب آپ بیمار ہوئے ——— تو کس نے آپ کے علاج پر روپیہ خرچ کیا تھا۔"

"مجھے معلوم نہیں ——— میرا خیال ہے تمہیں نے کیا ہوگا۔"

"آپ کا حافظہ بھی اب کمزور ہو گیا ہے ——— یا آپ جان بوجھ کر اپنے رشتہ دار کی مدد کو فراموش کر رہے ہیں۔"

"میں اپنے کسی رشتے دار کی امداد کا محتاج نہیں رہا اور نہ رہوں گا۔ اچھا خاصا کما لیتا ہوں ——— کھاتا پیتا ہوں ——— جتنا کھا سکتا ہوں کھاتا ہوں ——— جتنی پی سکتا ہوں، پیتا ہوں۔"

"آپ کو معلوم نہیں کہ پینا حرام ہے؟"

"معلوم ہے ـــــ آج کل تو جینا بھی حرام ہے۔ مگر چچا غالب کہہ گئے ہیں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

"یہ چچا غالب کون تھے ـــــ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟ ـــــ میں نے تو آج پہلی مرتبہ ان کا نام سنا ہے۔"

"وہ سب کے چچا تھے ـــــ بہت بڑے شاعر ـــــ"

"شاعروں پر خدا کی لعنت ـــــ بیڑا غرق کرتے ہیں لوگوں کا۔"

"بیگم یہ تم کیا کہہ رہی ہو، انہی کے دم سے تو زندگی کی رونق قائم ہے۔ یہ نہ ہوں تو چاروں طرف خشکی ہی خشکی نظر آئے ـــــ یہ لوگ پھول ہوتے ہیں، صاف و شفاف پانی کے ذھارے ہوتے ہیں ـــــ جو انسانوں کے ذہن کی آبیاری کرتے ہیں ـــــ یہ نہ ہوں تو ہماری زندگی بے نمک ہو جائے۔"

"بے نمک ہو جائے ـــــ کیسے بے نمک ہو جائے ـــــ یہاں نمک کی کوئی کمی ہے ـــــ جتنا چاہیئے لے لیجئے ـــــ اور وہ بھی سستے داموں، پر ـــــ ان لوگوں کو جنہیں آپ شاعر کہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ان کو کھیوڑے کی کان میں زندہ دفن کر دیا جائے، تاکہ وہ بھی نمک بن جائیں اور آپ ان کو چاٹتے رہیں۔"

"آج تم نے یہ کیسے پر پرزے نکال لئے؟"

"پرپرندوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی ——— میں کچھ نہیں جانتی ہوں کہ جب آپ سے کوئی معاملے کی بات کرے تو آپ بھنا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ ——— میں نے کبھی آپ کی ذات پر حملہ تو نہیں کیا۔ ہمیشہ سیدھی سادی بات کر دی"۔

"تمہاری سیدھی باتیں ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہیں ——— میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں ہو کیا گیا ہے ——— دو برس سے تم ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو ———"

"اِن برسوں میں مجھے آپ نے کیا سکھ پہنچایا ہے ———؟"

"بھئی معاف کرو مجھے ——— میں سونا چاہتا ہوں ——— ساری رات جاگتا رہا ہوں"۔

"کیا تکلیف تھی آپ کو ——— مجھے بھی تو کچھ اس کا علم ہو؟"

"تمہیں اگر اس کا علم بھی ہو جائے، تو اس کا مداوا کیا کرو گی؟"

"میں تو سخت نا اہل ہوں، کسی کام کی بھی نہیں ——— بس ایک صرف آپ ہیں جو دنیا کی ساری حکمت جانتے ہیں"۔

"بھئی میں نے کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا ——— لیکن عورت ذات ہمیشہ خود کو افضل سمجھتی ہے ——— حالانکہ وہ عام طور پر کم عقل ہوتی ہے"۔

"دیکھئے آپ طعن طروز پر اُتر آئے ——— یہ کہاں کی عقلمندی ہے"۔

"میں معافی چاہتا ہوں ـــــ تم نے چونکہ مجھے اکسایا تو یہ لفظ میری زبان سے نکل گئے، ورنہ تم جانتی ہو کہ گفتگو کے معاملے میں بڑا محتاط رہتا ہوں۔"

"جی ہاں رہتے ہوں گے ـــــ مجھ سے تو آپ ہمیشہ نوکرانیوں کا سا سلوک کرتے رہے۔"

"یہ سراسر بہتان ہے ـــــ تم تو میری ملکہ ہو۔"

"آپ بادشاہ کیسے بن بیٹھے ـــــ آپ کی سلطنت کہاں ہے؟"

"میری سلطنت، یہ میرا گھر ہے ـــــ میں ـــــ؟"

"اور آپ یہاں کے شہنشاہ ہیں؟"

"اس میں کیا شک ہے ـــــ تم نے طنزاً کہا ہے لیکن حقیقت میں اس سلطنت کا حکمران میں ہی ہوں۔"

"حکمران تو میں ہوں ـــــ اس لئے کہ اس گھر کا سارا بندوبست مجھے ہی کرنا پڑتا ہے ـــــ سب دیکھ بھال مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔"

"تم میری ملکہ ہو ـــــ اور ملکہ کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ نہیں رہنا چاہیے ـــــ اپنی مملکت کا دھیان رکھنا چاہیے ـــــ اس لئے تم بھی یہاں کی حکمران ہو ـــــ اس لئے کہ تم اس کا نظم و نسق برقرار رکھتی ہو نوکروں کی دیکھ بھال وغیرہ ـــــ اچھے سے اچھا کھانا پکواتی ہو ـــــ سارا دن پلنگ پر لیٹی آرام کرتی رہتی ہو۔"

"میں تو جو آرام کرتی ہوں سو کرتی ہوں، پر آپ مجھے یہ بتائیے ـــ"

"کیا؟"

"کچھ نہیں ـــــ آپ اس گھر کے حکمراں ہیں، اب میں آپ سے کیا کہوں"

"تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، بلاخوف و خطر کہو ـــــ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے؟"

"کہیں جہاں پناہ بگڑ نہ جائیں"

"مذاق برطرف رکھو، یہ بتاؤ تم کہنا کیا چاہتی ہو"

"کہنا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں، مگر آپ میں ٹھنڈے دل سے سننے کا مادہ ہی کہاں ہے؟"

"مادہ تو تم ہو ـــــ میں نر ہوں"

"اب آپ نے واہیات قسم کی گفتگو شروع کر دی ـــــ"

"کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایسی باتیں بھی کر لینی چاہئیں ـــ اس لئے کہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو"

"آپ کی طبیعت میں کئی دنوں سے انقباض ہے ـــــ سیدھے منہ کوئی بات ہی نہیں کرتے"

"میں تو چنگا بھلا ہوں ـــــ مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ہے ـــ ہو سکتا ہے کہ تمہارے تخیل نے بہت اونچی پرواز کی ہو، اگر ایسا ہی ہے تو کوئی

مسہل تجویز کر دو، تاکہ تمہاری تشفی ہو جائے۔"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی ——— صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں ———"

"بھئی پوچھ بھی لو جو کچھ پوچھنا ہے ——— مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو۔"

"آپ تو ذرا سی بات پر تنگ آجاتے ہیں۔"

"یہ ذرا سی بات ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی بکواس کرائی ——— یہی وقت میں اور کہیں صرف کرتا تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔"

"کیا فائدہ ہوتا؟ ——— بڑے لاکھوں کما لئے ہیں آپ نے بغیر اس بکواس کے ———"

"کمائے تو ہیں ——— لیکن تم یہ بتاؤ کہ کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ جب سے نئی نوکرانی آئی ہے، آپ کی طبیعت کیوں خراب رہنے لگی ہے؟"

"نئی نوکرانی کوئی بیماری ہے؟"

"جی نہیں ——— بیماری تو نہیں ——— لیکن میں نے اسے آج رخصت کر دیا ہے۔"

"کیوں؟ وہ تو بڑی اچھی تھی۔"

"آپ کی نظروں میں ہو گی ——— میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ بیس

روپے ماہوار میں اتنے اچھے کپڑے کیسے پہن سکتی تھی ——— بالوں میں خوشبودار تیل کہاں سے ڈالتی تھی ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟"

"آپ کو سب کچھ معلوم ہے ——— آپ کے بالوں سے بھی اسی تیل کی خوشبو آتی ہے ——— معلوم نہیں یہ تیل آپ نے کہاں چھپا رکھا ہے"

سنترپنج

میں لاہور کے ایک سٹوڈیو میں ملازم ہوا، جس کا مالک میرا بمبئی کا دوست تھا۔ اس نے میرا استقبال کیا، میں اسی کی گاڑی میں اسٹوڈیو پہنچا تھا۔ بغل گیر ہونے کے بعد اس نے اپنی شرافت بھری مونچھوں کو جو غالباً کئی دنوں سے ناتراشیدہ تھیں تھرکا کر کہا۔ "کیوں خواجہ اچھوڑ دی"۔

میں نے جواب دیا۔ "چھوڑنی پڑی"۔

اسٹوڈیو کا مالک جو اچھا فلم ڈائریکٹر بھی ہے (میں اسے سہولت کی خاطر گیلانی کہوں گا) مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا ـــــ یہاں اِدھر اُدھر کی بے شمار باتیں کرنے کے بعد اس نے چائے منگوائی۔ جو نہایت ذلیل تھی۔ زبردستی پلائی، کئی سگریٹ اس دوران پھونکے اور مجھ سے پھنکوائے۔

مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، چنانچہ میں نے اس سے کہا "یار چھوڑو اب چائے کی بکواس کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آج اتنے برسوں کے بعد یاد کیسے کر لیا؟"

"بس ایک دن اچانک یاد آ گئے ـــــ بلا لیا ـــــ بتاؤ اب صحت کیسی ہے؟"

"تمہاری دعا سے ٹھیک ہے۔" میرے لہجے میں دوستانہ طنز تھا۔ وہ ہنسا۔

"واہ میرے مولوی صاحب ـــــ میرا خیال ہے کہ جب سے تم خشک خشک ہوئے ہو، تمہاری ہر وقت شگفتہ رہنے والی طبیعت ٹھہر کر پانی کی طرح ٹھہر گئی ہے۔"

"ہو گا ایسا ہی۔"

"ہو گا کیا، ہے ہی ایسا معاملہ ـــــ لیکن خدا نہ کرے ایسی ذہانت جس کے سب معترف ہیں، اس کا بھی یہی حشر ہو ـــــ کیا تم اب بھی فلمی کہانی کا ڈھانچہ تیار کر سکتے ہو؟ ـــــ فرسٹ کلاس کہانی۔"

میں نے اس سے کہا۔ "فرسٹ، سیکنڈ، انٹر اور تھرڈ میں نہیں جانتا، البتہ کہانی ضرور ہو گی ـــــ تم سوچتے ہو فرسٹ کی کہانی وہ اسکرین پہ آتے ہی تھرڈ بن جائے ـــــ یا تھرڈ جس کو تم نے ڈبوں میں بند کر کے گودام میں رکھ چھوڑا تھا، گولڈن جوبلی فلم ثابت ہوا ـــــ کیا درست نہیں؟ ـــــ خیر ان باتوں کو چھوڑو ـــــ تم یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟"

اس نے مجھے ایک سگریٹ سلگا کر دیا اور سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھو منٹو،

میں ایک کہانی چاہتا ہوں ـــــ بڑا دلچسپ رومان ہو اور تم مجھے اس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتے کے اندر اندر دیدو، کیونکہ میں فلم ڈسٹری سے کنٹریکٹ کر چکا ہوں، تم سینریو کتنی دیر میں لکھ دو گے؟"

"فراغت سے ایک مہینے بعد۔"

سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے زور کے ساتھ ملے ـــــ اس کے اس عمل سے دو چیزیں ظاہر ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ اس کے ہاتھ گرم ہو گئے ہیں، دوم یہ کہ اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے کہ اس کو کہانی وقت پر مل جائے گی اور وہ جو کہ میری طرح بڑی تیزی سے کام کرنے والا ہے اسے وقتِ مقررہ کے اندر اندر ڈائرکٹ کر کے اس کے پرنٹ ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کر دیگا اور کنٹرکٹ کی رو سے جو یقا بارقم اس کے نام نکلتی تھی، اسی وقت میز پر دھرا لے گا۔

اس نے چند لمحات غور کیا۔ "کل ہی کام شروع کر دیگا۔"

میں نے جواب دیا۔ "کام تو میں شروع کر دوں ـــــ لیکن یہاں میرے لئے کوئی علیحدہ کمرہ ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔"

"اور ایک اسسٹنٹ؟"

"مل جائے گا ـــــ تو کل سے آنا شروع کر دو گے؟"

میں نے اس سے کہا۔ "دیکھو گیلانی ـــــ میرے گھر سے تمہارے اسٹوڈیو تک کا فاصلہ کافی ہے ـــــ تانگے میں آؤں تو قریب قریب ڈیڑھ گھنٹہ ـــــ بس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس نے پوچھا "کیوں؟"

"یعنی اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے ـــــ بس اسٹینڈ پر کھڑے رہے ہو ـــــ خدا خدا کر کے پانچ نمبر کی بس آگئی۔ مسافروں سے بھری ہوئی اور وہ بغیر ٹھہرے چلدی، اور تم خود کو دنیا کا کم ترین انسان محسوس کرتے ہو ـــــ جی میں آتا ہے کہ خودکشی کر لو ـــــ یا پھر دنیا والوں کی بے رُخی سے نجات حاصل کرنے کے لئے سنیاس دھار لو۔"

"گیلانی نے اپنی شرارت بھری مونچھیں تھرکائیں۔" میں شرط بدنے کے لئے تیار ہوں کہ تم کبھی دنیا تیاگ نہیں سکتے، جس دنیا میں کہ ہر قسم کی شراب ملتی ہے ـــــ اور خوبصورت عورتیں بھی۔"

میں نے چڑ کر کہا۔ "عورتیں جائیں جہنم میں ـــــ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں بمبئی کے ہر اسٹوڈیو میں جہاں میں نے کام کیا، ان سے دور ہی رہا ـــــ تم تو خیر اپنے وقت کے ڈون جوران ہو۔"

"مذاق اڑاتے ہو خواجہ میرا۔"

میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا۔ "نہیں گیلانی" ـــ

یا یوں کہہ لو ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

گیلانی مسکرایا۔ "خدائے بخشندہ تو بڑے عرصے سے تمہیں مرحوم و مغفور کر چکا ہے ——— تم بخشی ہوئی رُوح ہو۔"

میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے ——— میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں۔"

"فلسفہ مت بگھارو ——— یہ بتاؤ کیا ابھی تک تمہارے پاس وہ اردو ٹائپ رائٹر موجود ہے؟"

"اچھا تو تم یہ بتاؤ کہ وہ ایکٹرس جس سے تم نے کلکتے میں شادی کی تھی ابھی تک تمہارے پاس موجود ہے؟"

"گیلانی نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "موجود کیوں نہیں ہوگی ——— گویا تمہاری نظر میں ایکٹرس اور ٹائپ رائٹر میں کوئی فرق نہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔ "کیا فرق ہے؟ ——— ایک فلم پر ٹائپ کرتی ہے دوسری کاغذ پر ——— دونوں کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہیں۔"

گیلانی میری ان باتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر میں نے اس کو دلاسا دیا۔

"یار یہ سب مذاق تھا ـــــ تو میں کل آجاؤں ـــــ میرا مطلب ہے کہ تم گاڑی بھیج دو گے؟"

گیلانی صوفے پر سے اٹھا، اس کے ساتھ میں بھی۔ اس نے کہا۔ "ہاں ہاں بھئی ـــــ کب چاہیئے تمہیں گاڑی؟"

"کوئی وقت بھی مقرر کر لو ـــــ ساڑھے نو بجے صبح۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تم کاغذ وغیرہ آج ہی منگوا لینا ـــــ تاکہ میں اسٹوڈیو پہنچتے ہی کام شروع کر دوں۔ اور تم سے اُلٹا یہ نہ سنوں کہ دیکھو تم نے مجھے لیٹ ڈاؤن کر دیا ـــــ میرا اتنے ہزار روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔"

گیلانی نے بڑے پیار سے کہا۔ "کیا کہتے ہو یار ـــــ میں تمہاری طبیعت سے کیا واقف نہیں ـــــ کبھی کبھی تم ڈبکی لگا جایا کرتے ہو۔"

میں نے اس کو یقین دلایا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ تم مطمئن رہو۔ ہاں میرا ٹائپ رائٹر یہاں محفوظ تو رہے گا؟"

گیلانی کی عادت ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتا ہے۔ "محفوظ نہیں رہے گا تو کیا غنڈے اغوا کر لے جائیں گے ـــــ اپنے کسی عاشق کے ساتھ تمہاری مشین بھاگ نکلے گی۔"

میں بہت ہنسا ـــــ ہنستے ہنستے ہم دونوں نے اسٹوڈیو کا

چکر لگایا ـــــــ اس کے بعد اُس نے مجھے الوداع کہی اور میں اسی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا، جہاں پہنچتے ہی میں نے اپنے ٹائپ رائٹر کی جھاڑ پونچھ کی اس لئے کہ ایک مدت سے میں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ فلمی کہانی لکھنے کا اس دوران کوئی موقعہ ہی میسّر نہ آیا۔"

بگڑا ہوا مکینک یا مستری آرٹسٹ بن جاتا ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی اختراع کردہ محاورہ ہے۔ گیلانی شروع شروع میں مکینک تھا، بگڑ کر وہ آرٹسٹ بن گیا، پر وہ محنتی تھا۔ جب وہ مستری تھا تو اسے زیادہ سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ لیکن جب کیمرہ مین قلی سے ترقی کرتا کرتا کیمرہ مین بن گیا تو اس نے کیمرے کے ہر پیچ کے متعلق اپنی خداداد ذہانت اور جستجو طلب طبیعت کی بدولت یہ دریافت کر لیا کہ ان کا لوہے کے اس چوکھٹے میں اپنی اپنی جگہ کیا مصرف ہے۔

کیمرے کو وہ الٹا کرتا، کبھی سیدھا، کبھی اس کا گیٹ کھول کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اس سے اپنے مختلف سائز کے پیچ پرزوں کے ذریعے سے بوس و کنار میں مشغول رہتا۔

فرصت کے اوقات، یعنی جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی، وہ اپنی سائیکل پر شہر پہنچتا اور سارا دن کباڑیوں کی دکانوں پر صرف کرتا ـــــــ اس کو دنیا کے تمام کباڑیوں سے محبت ہے، اور ان کے کباڑ خانوں کو وہ بڑی

مقدس جگہیں تصور کرتا ہے۔ وہ ان دکانوں میں بیٹھ کر منصوبہ تیار کرتا رہتا کہ سلائی مشین کا ہینڈل جو بیکار پڑا ہے اگر لوہے کے فلاں ٹکڑے کے ساتھ ویلڈ کر دیا جائے اور اس کے فلاں کے اندر چھوٹے پنکھے جو ٹکڑ والی دکان میں موجود ہیں لگا دیئے جائیں تو فرسٹ کلاس دھونکنی بن سکتی ہے

خدا معلوم وہ کیا کیا سوچتا تھا۔ ان دنوں دراصل ذہنی ورزش کر رہا تھا۔ یہ وہ تیاری تھی جو وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ایڈیٹنگ بھی اسی طرح سیکھی۔ آس پاس کی ہر نفی سے ننھی شئے کا مطالعہ کیا اور آخر ایک دن اس نے اسٹوڈیو کی ایک فلم کی ایسی عمدہ ایڈیٹنگ کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سیٹھ نے سوچا کہ اچھے کیمرہ مین تو مل جائیں گے مگر ایسا باکمال ایڈیٹر جو سلولائڈ کے چھوٹے بڑے فیتے کے ٹکڑوں کو اس چابکدستی سے جوڑتا ہے کہ پھر اس میں مزید کتر بیونت ہو ہی نہیں سکتی چنانچہ ایڈیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دیا۔ تنخواہ اس کی وہی رہی جو بحیثیت کیمرہ مین تھی

وہ اپنا کام بڑی محنت اور تن دہی سے کرتا رہا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں وہ لیبارٹری سے بھی دلچسپی لیتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اس کے کل پرزوں میں چند اصلاحات اور ترکیبیں پیش کیں جو بڑی ردوکد کے بعد قبول کر لی گئیں۔ نتیجہ دیکھا گیا تو بڑا حوصلہ افزا تھا۔

سیٹھ نے ایک دن سوچا، کیوں نہ گیلانی کو ایک فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ جب اس سے پوچھا کہ تم کوئی فلم ڈائریکٹ کرو گے تو اس نے بڑی خود اطمینانی سے جواب دیا۔ "ہاں سیٹھ ——— پر اس میں کوئی دخل نہ دے۔"

کہانی آدھی گیلانی نے خود بنائی، آدھی ادھر اُدھر کے منشیوں سے لکھوائی اور اللہ کا نام لے کر شوٹنگ شروع کر دی۔ یہ فلم ختم ہوا اور نمائش کے لئے مقامی سینما ہاؤس میں پیش کیا گیا تو اس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

اس کے بعد اس نے لاہور میں دو فلم بنائے ——— یہ بھی سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئے ——— ایک کلکتے جا کر پھر بنایا، وہ بھی کامیاب تھا۔ یہاں سے وہ بمبئی پہنچا، کیونکہ وہاں کے فلمسازوں نے بڑی تگڑی تگڑی آفریں بھیجی تھیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس نے آفر قبول کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور کہانی چن دے کا منظر نامہ خود تیار کیا۔ فلم بن گیا اور اتنا بڑا باکس آفس ثابت نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ بٹوارے کے باعث دوسرے شہروں کے مانند بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے جس طرح دوسرے مسلمان ہجرت کر رہے تھے۔ اسی طرح گیلانی بھی بمبئی چھوڑ کر کراچی چلا گیا۔ یہاں سے وہ لاہور پہنچا اور ایک اسٹوڈیو کی داغ بیل رکھی، ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے لے کر کیلیں ٹھونکنے والے تک کو اس کی ذاتی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اسٹوڈیو تیار ہو گیا۔

لاہور کے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے ـــــ جب یہ اسٹوڈیو بنا تو ان کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ یہاں شوٹنگ شروع ہوگئی۔ اس کے بعد یہ چل نکلا۔ گیلانی اس دوران میں اسٹیج اور ادھر ادھر کے متعلقہ سامان کو درست اور مرمت کرانے میں مشغول رہا۔ اس کا دستِ راست لاہور ہی کا ایک نوجوان سراج دین تھا، جو قریب قریب آٹھ برس ٹائپ رائٹروں کی مرمت کا کام کرتا رہا۔ اس نے میری ٹائپ رائٹر کو دیکھا اور کہا کہ اب یہ مرمت طلب ہو چکی ہے۔ کام نہیں دیگی۔

اس کے بعد گیلانی نے خود میرے ٹائپ رائٹر کا معائنہ کیا اور فیصلہ صادر کیا کہ مشین میں کوئی نقص نہیں ـــــ مگر سراج اپنے تجربے کے بل بوتے پر مصر تھا۔ "نہیں حضور یہ اب مرمت طلب ہو چکی ہے۔ بڑا اور چھوٹے رولرز سب نئے لگوانے پڑیں گے۔ اوور ہالنگ ہوگی، اس کا کتابھی ناقص ہو چکا ہے۔ وہ بھی پڑے گا۔"

"تمہاری ٹانگوں پر۔"

"آپ میرا مذاق نہ اڑائیے ـــــ اچھا، خیر آپ ہی صحیح کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے گنجے سر پر ٹوپی درست کرتا ہوا چلا گیا۔ گیلانی نے اپنا خاص ٹول بکس منگوایا اور مشین کے سب پرزے الگ کر کے رکھ دیئے۔ کوئی پرزہ پتھر پر گھسایا، کوئی ریگ مار پر، کسی کے سرپیش لگائی، کسی کے تیل اور انکو دوبارہ

فٹ کر کے فہمندانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں صاحب ٹھیک ہوگئی یا نہیں"

میں نے ایسے ہی کہہ دیا "ہاں اب ٹھیک ہے"

گیلانی نے اپنے پاس کھڑے اسسٹنٹ کو بلایا۔ "جاؤ، اس اُلّو کے پٹھے ایکسپرٹ سراج کو بلا کر لاؤ"

چند منٹ میں سراج حاضر ہوگیا۔ اس نے مشین چلائی تو دس پندرہ بار ٹپ ٹپ کرنے کے بعد خاموش ہوگئی۔ سراج نے گیلانی سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیلانی بڑے تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ "اچھا، تم اسے بناؤ، دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو"

مجھے اپنی پندرہ سالہ عزیز مشین پہ ترس آرہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے جب اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے پڑے تھے۔ دوسرے دن سراج نے اپنا ٹول بکس ریکارڈنگ روم میں سے منگوایا۔ اور میری مشین پہ اپنی ماہرانہ سرجری شروع کر دی۔

ضروری پرزے نکال کر اس نے علیحدہ رکھ لئے اور باقی حصے پٹرول میں ڈال دیئے۔ اب ان کی چتا جلانے کے لئے صرف ماچس کی ایک تیلی کافی تھی۔ میں خاموش رہا اور یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

کتے کے جبڑوں کو ایک پلاس کے ساتھ زور سے پکڑا اور میری طرف

دیکھ کر کہا۔" اس سالے کے دندانے ٹھیک کر کے ہی رہوں گا۔ پہلے تو ایسے ہی کوشش کرتا ہوں، اگر نہ ہوئے تو اس پرزے ہی کو نکال کر ورکشاپ جا کر اس کا نقص رفع کردونگا ــــــ بڑا سخت اسٹیلی ہوتا ہے، اس کو مشین کی تمام لمبر کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔"

میں ہوں ہوں کرتا رہا اور وہ مجھے لکچر اتار رہا ــــــ اس نے چھوٹی پلاس سے چھوٹے پیچ کس سے بہت جتن کی کہ وہ کتا باہر نکل آئے لیکن وہ کچھ عجیب ڈھیٹ تھا۔ یہ کتّے کے پالنے والے ہی جانتے ہوں گے کہ وہ کس نسل کا تھا۔

سراج لگا رہا۔ اس کوشش میں اس نے آدھ گھنٹہ اور صرف کیا اور وہ دم دیا کہ باہر نکل آیا اور سراج نے اسے یوں الٹا یا جیسے وہ نتھا سا پلا ہو۔ اب اس پلے پر کام شروع ہو گیا۔ ورکشاپ کے اوزار آزمائے گئے اس کے جبڑے ٹھیک نہ ہوتے ــــــ آخر اس کے استاد نے سراج سے کہا اسے سنٹر پیچ کرو۔ دو بار سنٹر پیچ کرنے پر بھی خاطرخواہ نتیجہ نہ نکلا۔ دوسرے دن شہر کا بہت بڑا گنی مستری سراج کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور مسکرا کر کہا" منٹو صاحب! اب کوئی فکر نہ کیجئے۔"

اصل میں مجھے کوئی فکر نہیں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد مجھے جستجو ہوئی کہ دیکھیں اپنے وقت کے یہ نیوٹن کیا کاریگری دکھاتے ہیں۔ ورکشاپ پہنچا تو سنٹر پیچ ان

چھریوں بھرے ہاتھ میں ہے ـــــ میں کباب ہو گیا اور وہاں سے اٹھ بھاگا تاکہ وہ کہیں میرا اسٹنٹ پنچ نہ کر دیں اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاؤں۔

ڈانس فلمایا جا رہا تھا، میں اس کے شاٹس دیکھ دیکھ کر اپنا غم غلط کرتا رہا ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ غم رتی بھر غلط نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ڈائریکٹر کی شکل اس سے بہت ملتی جلتی تھی۔

رات جب پیک اپ ہوا تو بارہ بج رہے تھے۔ اتفاق سے ایک تانگہ مل گیا ـــــ جب سڑک پہ اس نے اپنا سفر شروع کیا تو دو فرلانگ کے فاصلے پر میں نے ایک سایہ دیکھا۔ جب قریب پہنچا تو وہ سراج تھا۔ ایک دم میں زور سے چلایا۔ "پکڑ لو اس آدمی کو اور اس کا تن سر پنچ کر دو"۔

یہ سنتے ہی وہ اس تیزی سے بھاگا کہ تانگہ اس کا مقابلہ نہ کر سکا ہم اسے جا لیتے مگر وہ ایک کھیت میں کود پڑا۔ میں بہت ہنسا۔ اس نے شاید یہ سمجھا ہو گا کہ اس کا تن سر سے جدا کرنے کا حکم دیا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے سراج سے پوچھا۔ "بڑی دیر لگا دی"؟

سراج نے ٹوپی اتار کر ایک طرف چارپائی پر رکھی اور کہا "شکر ہے خدا کا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ ایک ڈاکو سڑک پہ میرا سر تن پنچ کرنے والا تھا"۔

اس کی بیوی نے پوچھا۔ "یہ سر تن کیا ہوتا ہے"؟

"اس وقت نہیں ـــــ رات کو ـــــ اوزار میرے پاس ہیں"۔

جسم اور رُوح

مجیب نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔ "کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟
گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دنیا میں ایسے کئی اشخاص موجود ہیں جو ایک منٹ کے اندر اندر لاکھوں اور کروڑوں کو ضرب دے سکتے ہیں۔ ان کی تقسیم کر سکتے ——— آنے پائی کا حساب چیم زدن میں آپ کو بتا سکتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران غنی یہ کہہ رہا تھا۔ "انگلستان میں ایک آدمی ہے جو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد فوراً بتا دیتا ہے کہ اس قطعۂ زمین کا طول عرض کیا ہے ——— رقبہ کتنا ہے ——— اس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ وہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے تنگ آ گیا ہے ——— وہ جب

بھی کہیں باہر کھلے کھیتوں میں نکلتا ہے، تو ان کی ہریالی، ان کا حسن اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس قطعۂ زمین کی پیمائش اپنی آنکھوں کے ذریعے سے شروع کر دیتا ہے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا کتنا رقبہ رکھتا ہے ـــــ اس کی لمبائی کتنی ہے۔ چوڑائی کتنی ہے، پھر اسے مجبوراً اپنے اندازے کا امتحان لینا پڑتا ہے۔ "فیتہ ٹیپ" کے ذریعے سے اس قطعۂ زمین کو ناپتا اور وہ اس کے اندازے کے عین مطابق نکلتا ـــــ اگر اس کا اندازہ غلط ہوتا تو اسے بہت تسکین ہوتی بعض اوقات فاتح اپنی شکست سے بھی ایسی لذت محسوس کرتا ہے جو اسے فتح سے نہیں ملتی، اصل میں شکست، دوسری شاندار فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔"

میں نے غنی سے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو ـــــ دنیا میں ہر قسم کے عجائبات موجود ہیں ـــــ"

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مجیب جو اس گفتگو کے دوران خاموش بیٹھا کافی پی رہا تھا، اچانک مجھ سے سوال: "کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟"

میں سوچنے لگا کہ مجیب کس آدمی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ حامد؟ ـــــ نہیں وہ آدمی نہیں، میرا دوست ہے۔

الیاس ـــــ اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

شبیر، اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی ——— آخر یہ کس آدمی کا حوالہ دیا گیا تھا؟"

میں نے مجیب سے کہا۔ "تم کس آدمی کا حوالہ دے رہے ہو؟"

مجیب مسکرایا۔ "تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔"

"بھئی میرا حافظہ تو بچپن ہی سے کمزور رہا ہے ——— تم پہیلیوں میں باتیں نہ کرو ——— بتاؤ وہ آدمی کون ہے جس سے تم ہمارا تعارف کرانا چاہتے ہو۔"

مجیب کی مسکراہٹ میں اب ایک عجیب قسم کا اسرار تھا۔ "بوجھ لو۔"

"میں کیا بوجھوں گا، جبکہ وہ آدمی تمہارے پیٹ میں ہے۔"

عارف، اصغر اور مسعود بے اختیار ہنس پڑے۔ "عارف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "وہ آدمی اگر مجیب کے پیٹ میں ہے تو آپ کو اس کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

میں نے مجیب کی طرف ایک نظر دیکھا اور عارف سے مخاطب ہوا۔ "میں ساری عمر اس مہدی کی ولادت کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔"

مسعود نے اپنے سگریٹ کو ایش ٹرے کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے صاحبان! ہمیں اپنے دوست مسٹر مجیب کی بات کا مذاق نہیں اڑانا چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ مجیب سے مخاطب ہوا۔ "مجیب صاحب فرمایئے

آپ کو کیا کہنا ہے ـــــ ہم سب بڑے غور سے سنیں گے۔"

مجیب تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اپنا بھاری سوٹ سلگا کر بولا۔ "معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اس آدمی کے متعلق آپ سے پوچھا جسے آپ جانتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجیب تم کیسی باتیں کرتے ہو، بہرحال تم اس آدمی کو جانتے ہو۔"

مجیب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔ "بہت اچھی طرح ـــــ جب ہم دونوں برما میں تھے تو دن رات اکٹھے رہتے تھے ـــ عجیب و غریب آدمی تھا۔"

مسعود نے پوچھا۔ "کس لحاظ سے؟"

مجیب نے جواب دیا۔ "ہر لحاظ سے ـــــ اس جیسا آدمی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "بھائی مجیب، اب بتا بھی دو، وہ کون حضرت تھے۔"

"بس حضرت ہی تھے۔"

عارف مسکرایا۔ "چلو قصہ ختم ہوا ـــــ وہ حضرت تھے۔"

"اور بس۔"

مسعود یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ وہ حضرت کون تھے۔ یہی مجیب

تمہاری ہر بات نرالی ہوتی ہے ـــــ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ وہ کون آدمی ہے جس کا ذکر تم نے اچانک چھیڑ دیا۔"

مجیب طبعاً خاموشی پسند تھا، اس کے دوست احباب ہمیشہ اس کی طبیعت سے نالاں رہتے ـــــ لیکن اس کی باتیں سچی تلی ہوتی تھیں۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔" معذرت خواہ ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کو مخمصے میں گرفتار کر دیا ـــــ بات دراصل یہ ہے کہ جب یہ گفتگو شروع ہوئی تو میں کھو گیا ـــــ مجھے ـــــ مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

میں نے پوچھا۔" وہ ایسا زمانہ کونسا تھا؟"

مجیب نے اب ایک لمبی کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔" اگر آپ سمجھتے ہوں کہ اس زمانے سے میری زندگی کے کسی رومان کا تعلق تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کم فہم ہیں۔"

میں نے مجیب سے کہا۔" ہم تو آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ اگر آپ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم کم فہم ہیں تو ٹھیک ہے، لیکن وہ آدمی ـــــ؟"

مجیب مسکرایا۔" وہ آدمی، آدمی تھا ـــــ لیکن اس میں خدا نے بہت سی قوتیں بخشی تھیں۔"

مسعود نے پوچھا۔" مثال کے طور پر ـــــ؟"

"مثال کے طور پر یہ کہ وہ ایک نظر دیکھنے کے بعد بتا سکتا تھا کہ آپ نے کس رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ ٹائی کیسی تھی۔ آپ کی ناک ٹیڑھی تھی یا سیدھی۔ آپ کے کس گال پہ کہاں اور کس جگہ تل تھا ——— آپ کے ناخن کیسے ہیں۔ آپ کی داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔ آپ نے بھنویں مونڈی ہوئی ہیں ——— موزے فلاں ساخت کے پہنے ہوتے تھے ——— قمیض پاپلین کی تھی، مگر گھر میں دھلی ہوئی۔"

یہ سن کر میں نے واقعتاً محسوس کیا کہ جس شخص کا ذکر عجیب کر رہا ہے عجیب و غریب ہستی کا مالک ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا: "بڑا معرکہ خیز آدمی تھا۔"

"جی ہاں ——— بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ——— اس کو اس بات کا غم تھا کہ اگر وہ اسے من و عن اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے جو کبھی غلط نہیں ہونگے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اندازہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ واقعی درست ہے؟"

"سو فیصد ——— ایک مرتبہ میں نے اس سے بازار میں پوچھا، یہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گذری ہے، کیا تم اس کے متعلق تمام تفصیلات بیان کر سکتے ہو۔"

میں اس لڑکی سے ایک گھنٹہ پہلے مل چکا تھا۔ وہ ہمارے ہمسائے

مسٹر دوجوائے کی بیٹی تھی اور میری بیوی سے سلائی کی مشین مستعار لینے آئی تھی میں نے اسے غور سے دیکھا تھا، اسی لئے بغرضِ امتحان میں نے مجیب سے یہ سوال کیا تھا۔

مجیب مسکرایا۔ "تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ـــــ میں ـــــ میں ـــــ"

"نہیں تم میرا امتحان لینا چاہتے تھے ـــــ خیر سنو ـــــ وہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گذری ہے اور جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا ـــــ مگر لباس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے، اس لئے کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں سلامت ہوں اور ہوش و حواس درست ہوں، کہہ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا تھا ـــــ ویسے ایک چیز جو مجھے اس میں خاص طور پر نظر آئی، وہ اس کے داہنے ہاتھ کی چھینگلیا تھی۔ اس میں کسی قدر خم ہے ـــــ اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن مغروب تھا اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرائش کے فن سے محض کوری ہے۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے ایک معمولی سی نظر میں یہ سب چیزیں کیسے بھانپ لیں ـــــ میں ابھی اسی حیرت میں غرق تھا کہ مجیب نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں جو خاص چیز مجھے نظر آئی

وہ اس کے داہنے گال کا داغ تھا ——— غالباً لاہور سول ہسپتال کا ہے۔"

"مجیب کا کہنا درست تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔" یہ سب باتیں جو تم نے اتنے وثوق سے کہی ہیں تمہیں کیونکر معلوم ہو جاتی ہیں؟"

مجیب مسکرایا۔" میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا ——— اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں ہر آدمی کو صاحبِ نظر ہونا چاہیئے ——— صاحبِ نظر سے میری مراد ہر اس شخص سے ہے جو ایک ہی نظر میں دوسرے آدمی کے تمام خدّ و خال دیکھ لے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔" خدوخال دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے ——— خدوخال ہی تو انسان کا صحیح کردار بیان کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے، میں تمہارے اس نظریئے سے متفق نہیں ہوں۔"

"نہ ہو ——— مگر میرا نظریہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔"

"رہے، مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے ——— بہرحال میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان غلطی کا پتلا ہے ——— ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو۔"

"یار غلطیاں درستیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔"

"یہ تمہارا عجیب فلسفہ ہے۔"

"فلسفہ کاہے کا گوبر ہے۔"

"اور گوبر؟"

مجیب مسکرایا۔ "وہ ـــــ وہ! ـــــ اپلا کہہ لیجئے۔ جو ایندھن کے کام آتا ہے۔"

ہمیں معلوم ہوا کہ مجیب ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوگیا ہے۔ پہلی ہی نگاہ میں اس نے اس کے جسم کے ہر خدوخال کا صحیح جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لڑکی بہت متاثر ہوئی، جب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جو صرف ایک نظر میں سب چیزیں دیکھ لیتے ہیں تو وہ مجیب سے شادی کرنے کے لئے رضامند ہوگئی۔

ان کی شادی ہوگئی ـــــ دلہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے۔ اس کی دائیں کلائی میں کس ڈیزائن کی دست لچھی تھی ـــــ اس میں کتنے نگینے تھے ـــــ یہ سب تفصیلات اس نے ہمیں بتائی۔

.....

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہوگئی ـــــ محض اس لئے کہ مجیب صرف ان چیزوں کو ایک نظر میں دیکھ کر اپنے ذہن میں کسی تکلیف کے بغیر محفوظ کر سکتا تھا لیکن وہ روح کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

یہ دنیا بھی عجیب و غریب ہے ـــــ خاص کر آج کا زمانہ ـــــ قانون کو جس طرح فریب دیا جاتا ہے، اس کے متعلق شاید آپ کو زیادہ علم نہ ہو۔ آج کل قانون ایک بے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ادھر کوئی نیا قانون بنتا ہے، ادھر یار لوگ اس کا توڑ سوچ لیتے ہیں، اس کے علاوہ اپنے بچاؤ کی کئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔

کسی اخبار پر آفت آنی ہو تو آیا کرے، اس کا مالک محفوظ و مامون رہے گا۔ اس لئے کہ پرنٹ لائن میں کسی قصائی یا دھوبی کا نام بحیثیت پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کے درج ہوگا۔ اگر اخبار میں کوئی ایسی تحریر چھپ جائے جس پر گورنمنٹ کو اعتراض ہو تو اصل مالک کے بجائے وہ دھوبی یا

قصائی گرفت میں آجائے گا۔ اس کو جرمانہ ہوگا، یا قید ـــــ جرمانہ تو ظاہر ہے کہ اخیار کا مالک ادا کر دے گا، مگر قید تو وہ ادا نہیں کر سکتا، لیکن ان دو پارٹیوں کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر قید ہوئی تو اس کے گھر اتنے روپے ماہوار پہنچا دیا کریگا۔

ایسے معاہدوں میں خلاف ورزی بہت کم ہوتی ہے۔

جو لوگ ناجائز طور پر شراب بیچتے ہیں، ان کے پاس دو تین آدمی، ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کا صرف یہ کام ہے کہ اگر پولیس چھاپہ مارے تو وہ گرفتار ہو جائیں اور چند ماہ کی قید کاٹ کر واپس آجائیں ـــــ اس کا معاوضہ ان کو معقول مل جاتا ہے۔

چھاپہ مارنے والے بھی پہلے سے مطلع کر دیتے ہیں کہ ہم آرہے ہیں تم اپنا انتظام کر لو ـــــ چنانچہ فوراً انتظام کر لیا جاتا ہے یعنی مالک غائب غلہ ہو جاتا ہے اور وہ کرائے کے آدمی گرفتار ہو جاتے ہیں ـــــ یہ بھی ایک قسم کی ملازمت ہے، لیکن دنیا میں جتنی ملازمتیں ہیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "امین، اس دفعہ کیسے جیل میں گئے؟"

امین مسکرایا۔ "اپنے کاروبار کے سلسلے میں۔"

"کیا کاروبار تھا؟"

"جو ہو رہا ہے، وہی تھا۔"

"بھئی بتاؤ تو؟"

بتانے کی کیا ضرورت ہے ـــــ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔"

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اس سے کہا۔ "امین، تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے؟"

امین پہلوان مسکرایا۔ "جناب ـــــ پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں، حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل تک نہیں دیکھی ـــــ ان پڑھ ہوں ـــــ کوئی ہنر بھی مجھے نہیں آتا ـــــ ہاں جیل جانا آتا ہے ـــــ وہاں میں خوش رہتا ہوں مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی ـــــ آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں ـــــ کیا وہ جیل نہیں؟"

میں لاجواب ہو گیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو امین ـــــ لیکن دفتر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے ـــــ لوگ انہیں پری نگاہوں سے نہیں دیکھتے ـــــ"

"کیوں نہیں دیکھتے ـــــ ضلع کچہری کے جتنے منشی اور کلرک ہیں انہیں

کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے ـــــ رشوتیں لیتے ہیں ـــــ جھوٹ بولتے ہیں اور پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں۔ مجھ میں کوئی عیب نہیں ـــــ میں اپنی روزی بڑی ایمانداری سے کماتا ہوں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "کس طرح؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کاٹتا ہوں، جیل میں محنت و مشقت کرتا ہوں، اور بعد میں اس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا بھگتی تھی، مجھے دو تین سو روپے ملتا ہے، تو یہ میرا معاوضہ ہے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ـــــ میں رشوت تو نہیں لیتا۔ حلال کی کمائی کھاتا ہوں۔ ـــــ لوگ مجھے غنڈہ سمجھتے ہیں ـــــ بڑا خطرناک غنڈہ ـــــ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا ـــــ میری لائن بالکل الگ ہے۔"

اس کی لائن واقعی دوسروں سے الگ تھی، مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کاٹنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، وہ بڑا سنجیدہ مگر گنوار قسم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ قید کاٹنے کے بعد جب بھی آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاؤنڈ زیادہ ہوتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں کیا وہاں کا کھانا راس آ جاتا ہے؟"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "کھانا کیسا بھی ہو، اس کو راس کرنا آدمی کا اپنا کام ہے ——— مجھے دال سے نفرت تھی، لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں کنکروں بھری دال دی گئی اور ریت ملی روٹی ملی تو میں نے کہا ——— امین یار ——— یہ سب سے اچھا کھانا ہے ——— کھا اور ڈنٹر پیل، خدا کا شکر بجالا ——— چنانچہ میں ایک دو روز ہی میں اس کا عادی ہو گیا ——— مشقت کرتا، کھانا کھاتا اور یوں محسوس کرتا جیسے میں نے گنجے کے ہوٹل سے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے ———"

میں نے ایک دن اس سے پوچھا "امین! تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے؟"

اس نے دونوں کان پکڑے۔ "خدا بچائے اس محبت سے، مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا "تمہاری ماں زندہ ہے؟"

"جی ——— خدا کے فضل و کرم سے ——— بہت بوڑھی ہے لیکن آپ کی دعا سے، اس کا سایہ میرے سر پہ دیر تک قائم رہے گا ——— ——— اور وہ تو ہر وقت میرے لئے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت دے۔"

میں نے اس سے کہا۔ "خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے ——— پر

میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی ہے یا نہیں! دیکھو جھوٹ نہیں بولنا؟"

امین پہلوان نے بڑے تیز لہجے میں کہا ——— میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا ——— میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔"

میں خاموش ہو رہا

تیسرے روز اس کی ماں پر فالج گرا اور وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔

امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا، وہ سوگوار مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک رئیس کی طرف سے اسے بلاوا آیا ———

وہ اپنی عزیز ماں کی میّت چھوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا ——

"کیوں میاں صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

میاں صاحب نے کہا۔ "تمہیں کیوں بلایا جاتا ہے؟ ——— ایک خاص کام ہے۔"

امین نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا پوچھا "حضور یہ خاص کام کیا ہے؟"

میاں صاحب نے سگریٹ سلگایا۔ "بلیک مارکیٹ کا قصہ ہے ــــــ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپہ مارا جائے گا، سو میں نے سوچا کہ امین پہلوان بہترین آدمی ہے، جو اس کو نمٹا سکتا ہے۔"

امین نے بڑے مغموم اور زخمی انداز میں کہا۔ "آپ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"بھئی خدمت ودمت کی بات تم مت کرو ــــــ بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپہ پڑے تو گودام کے مالک تم ہو گے ــــــ گرفتار ہو جاؤ گے ــــــ زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہو گا ــــــ اور ایک دو برس کی قید۔"

"مجھے کیا ملے گا؟"

"جب وہاں سے آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا۔"

امین نے میاں صاحب سے کہا۔ "حضور! یہ بہت دور کی بات ہے جرمانہ تو آپ ادا کر دیں گے ــــــ لیکن قید تو مجھے کاٹنی پڑے گی ــــــ آپ باقاعدہ سودا کریں۔"

میاں صاحب مسکرائے۔ "تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے؟ ــــــ پچھلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تمہیں تین مہینے کی قید ہوئی، تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہم نہ پہنچائی ــــــ

تم نے باہر آکر مجھ سے کہا کہ وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں تھی ـــــ اگر اب تم کچھ عرصے کے لئے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں ہر آسائش ہوگی۔"

امین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔" میاں صاحب، میری ماں مر گئی ہے۔"

"کب؟"

"آج صبح۔"

میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا۔" کفنا دفنا دیا ہوگا؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔" میاں صاحب، ابھی تو کچھ بھی نہیں ہو سکا ـــــ میرے پاس تو افیم کھانے کے بھی کچھ نہیں۔"

میاں صاحب نے چند لمحات حالات پر غور کیا اور امین سے کہا "تو ایسا کر ـــــ میرا مطلب ہے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست میں ابھی کئے دیتا ہوں ـــــ تم کسی قسم کا تردد نہ کرو ـــــ تم گودام پر جاؤ اور اپنی ڈیوٹی سنبھال لو۔"

امین نے اپنی قمیض کی میلی آستین سے آنسو پونچھے۔" لیکن میاں صاحب ـــــ میں ـــــ میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دوں۔"

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔" یہ سب رسمی چیزیں ہیں۔"

مرحومہ کو دفنانا ہے ـــــ سو یہ کام بڑی اچھی طرح ہو جائے گا ـــــ تمہیں جنازے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے ـــــ تمہارے ساتھ جانے سے مرحومہ کو کیا راحت پہنچے گی ـــــ وہ تو بے چاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے ـــــ اس کے جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے ـــــ کیا فرق پڑتا ہے ـــــ اصل میں تم لوگ جاہل ہو ـــــ میں اگر مر جاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے جنازے میں کس کس دوست اور عزیز نے شرکت کی تھی ـــــ مجھے اگر جلا بھی دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے ـــــ میری لاش کو چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے اس کی کیا خبر ہو گی ـــــ تم زیادہ جذباتی نہ بنو ـــــ دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق سوچا جائے ۔ میں یہ پوچھتا ہوں تمہاری کمائی کے ذریعے کیا ہیں ؟"

امین سوچنے لگا ۔ چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا ـــــ "حضور ـــــ میری کمائی کے ذریعے آپ کو معلوم ہیں ـــــ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں ؟"

میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ تمہیں میرا کام کرنے میں کیا حیل و حجت ہے میں تمہاری ماں کی تجہیز و تکفین کا ابھی بندوبست کئے دیتا ہوں ـــــ اور جب تم جیل سے واپس آؤ گے تو ـــــ"

امین نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا۔ "تو آپ میرا بھی بندوبست کر دیں گے؟"

میاں صاحب بوکھلا گئے۔ "تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان"۔

امین نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔ "امین پہلوان کی ایسی کی تیسی۔ آپ یہ بتائیں کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے ــــــ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا۔"

"ایک ہزار تو بہت زیادہ ہے۔"

امین نے کہا۔ "زیادہ ہے یا کم ــــــ میں کچھ نہیں جانتا ــــــ میں جیب قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پختہ بناؤں گا ــــــ سنگِ مرمر کی ــــــ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔"

میاں صاحب نے اس سے کہا۔ "اچھا بھئی ایک ہزار ہی لے لینا۔"

امین نے میاں صاحب سے کہا۔ "تو لائیے، اتنے روپے دیجیئے کہ میں کفن دفن کا انتظام کر لوں ــــــ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کے لیئے حاضر ہو جاؤں گا۔"

میاں صاحب نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا۔ "لیکن تمہارا کیا بھروسہ ہے؟"

امین کو یوں محسوس ہوا، جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے۔

"میاں صاحب آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں؟ ــــ بے ایمان آپ ہیں۔ اس لئے کہ اپنے فعلوں کا بوجھ میرے سر پہ ڈال رہے ہیں۔"

میاں صاحب موقع شناس تھے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ امین بگڑ گیا ہے چنانچہ انہوں نے فوراً اسے اپنی چرب زبانی سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن امین پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ غسال اس کی ماں کو آخری غسل دے چکے ہیں۔ کفن بھی پہنایا جا چکا ہے ــــ امین بہت متحیر ہوا کہ اس پہ یہ مہربانی کس نے کی ہے؟ میاں صاحب نے؟ ــــ لیکن وہ تو سودا کرنا چاہتے تھے۔

اس نے ایک آدمی سے جو تابوت کو سجانے کے لئے پھول گوندھ رہا تھا پوچھا۔ "یہ کس آدمی نے اتنا اہتمام کیا ہے؟"

پھول والے نے جواب دیا۔ "حضور آپ کی بیوی نے۔"

امین چکرا گیا ــــ وہ اپنے شدید تعجب کا مظاہرہ کرتا۔ مگر خاموش رہا ــــ پھول والے سے صرف اتنا پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

پھول والے نے جواب دیا۔ "حی اندر ہیں ــــ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

امین اندر گیا ــــ تو دیکھا کہ ایک نوجوان، خوبصورت لڑکی اس

کی چارپائی پر بیٹھی ہے ـــــ امین نے اس سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں ..... یہاں کیوں آئی ہیں!"

اس لڑکی نے جواب دیا۔ "میں آپ کی بیوی ہوں" ـــ یہاں کیوں آئی ہوں ـــــ یہ آپ کا عجیب و غریب سوال ہے۔"

امین نے اس سے پوچھا۔ "میری بیوی تو کوئی بھی نہیں ـــ بتاؤ تم کون ہو؟"

لڑکی مسکرائی۔ "میں ـــــ میاں ـــــ دین کی بیٹی ہوں ـــ ان سے جو آپ کی گفتگو ہوئی، میں نے سب سنی ـــ اور ـــ اور"

امین نے کہا۔ "اب اور کہنے کی ضرورت نہیں۔"

تپش کاشمیری

مجھے ان کا اصل نام ابھی تک معلوم نہیں، حالانکہ میں ان کو بارہ برس سے جانتا ہوں۔ سات برس تو ہم اکٹھے ایک ساتھ رہے۔ دراصل ان کا نام پوچھنے کی مجھے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ تپش کاشمیری کافی تھا۔ وہ اسی نام سے مشہور تھے۔

تپش کاشمیری عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ جب وہ لاہور میں تھے تو ضلع کچہری کی ایک عدالت میں اہلمد تھے۔ آپ نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا تو آپ پیادہ ہو گئے۔ اس ترقی معکوس کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہر حالت میں خوش رہتے تھے۔

جس مجسٹریٹ سے وہ منسلک تھے، اس کی ہر روز ہجو لکھتے اور کاغذاس

کے میز پر رکھ آتے، وہ چیختا چلاتا۔ مگر تپش صاحب خاموش رہتے، جیسے ان کو کسی بات کا علم ہی نہیں۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے بمبئی میں ایک ناگپوری شاعر نے جو بزعم خود فی البدیہہ شعر کہنے میں ـــــ ظفر علی خاں سے کئی مصرعے آگے تھے، تپش صاحب سے کہا۔ حضرت، چلو آج گفتگو شعروں ہی میں ہو۔"

تپش صاحب نے بڑی انکساری کے ساتھ کہا۔ "جیسے آپ کی مرضی" اور ساتھ ہی گفتگو کا آغاز ایک شعر سے کر دیا۔ ناگپوری شاعر سٹ پٹا گئے، اور ذہن پر زور دے کر تپش صاحب کے اس شعر کا جواب شعر میں فکر کرنے لگے

تپش صاحب نے فوراً ایک اور شعر گھڑ کر ان سے پوچھا کہ جناب دیر کیوں لگا رہے ہو۔ جلدی گفتگو شروع کیجئے۔

ناگپوری شاعر بوکھلا گیا۔ میرا خیال ہے ان کے اس استفسار سے اس کے دماغ سے وہ سب کچھ نکل گیا جو اس نے بڑی محنت سے سوچا تھا۔

تپش صاحب نے اس پہ تین چار اور چست کر دیئے اور وہ بے چارہ ناگپوری چاروں شانے چت ہو گیا۔

میں یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تپش صاحب کی شاعری میں کوئی جان نہیں۔ یوں تو ان کا ہر شعر بڑا چبا تلا ہوتا ہے، عروض کی کوئی خامی نہیں

ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھرم کانٹے میں تل کر آیا ہے، بڑی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور قریب قریب ہر روز دو تین غزلیں یا نظمیں فی البدیہہ کہتے ہیں، لیکن شاذ و نادر ان کے قلم سے کوئی ایسا شعر نکلتا ہے جو صحیح معنوں میں شعر کہلانے کا مستحق ہو۔

انہوں نے بلا مبالغہ دس بارہ لاکھ شعر لکھے ہوں گے، مگر ان کو وہ باعثِ افتخار نہیں سمجھتے۔ وہ خود کو بھی شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے۔ ان کو اپنی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ اور بیان کروں، میں پیش صاحب کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں چند اور باتیں بھی بتانا چاہتا ہوں جو بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔

ایک زمانہ تھا وہ لاہور کے ضلع کچہری میں ملازم تھے۔ ایک دفعہ ایسا آیا کہ ان کو اسلامیہ اسکول کے ایک لڑکے سے عشق ہو گیا، بڑا افلاطونی قسم کا، ان کو معلوم ہوا کہ یہ لڑکا نماز پڑھتا ہے، صبح سویرے اپنے محلے کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے جاتا ہے ـــــ یہ معلومات حاصل ہوتے ہی آپ صبح تین بجے اٹھتے، سخت سردیوں کا موسم تھا، مسجد میں جا کر جاڑو دیتے پھر ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کرتے اور اذان دینا شروع کر دیتے۔ مسجد کا ملا جو بہت بڈھا اور سست تھا، اپنے حجرے میں چونکہ پڑا تا کہ یہ اذان کون دے رہا ہے۔

جب تک وہ اٹھ کر باہر نکلتا، تپش صاحب نے امامت شروع کر دی ہوتی تھی وہ لڑکا ان کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوتا۔ اس سے ان کو بڑی روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی ـــــ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔

ایک مرتبہ اس لڑکے کی سائیکل خراب ہو گئی۔ اس نے اپنے نوکر کو دی کہ ٹھیک کرا لائے۔ تپش صاحب نے دیکھ لیا اور سائیکل نوکر سے لے کر ایک دکان پر لے گئے۔ اس کے تمام پرزے علیحدہ کر دیئے۔ مٹی کے تیل میں ڈبو کر ان کو صاف کیا۔ دکاندار سے جوان کا دوست تھا کپڑا مانگا کہ وہ انہیں خشک کریں، مگر اس کے پاس نہیں تھا، چنانچہ تپش صاحب نے اپنی نئی بوسکی کی قمیض اتاری، اس کو پھاڑا، اور تمام پرزوں پر سے تیل خشک کر کے ان کو خوب چمکایا۔ جب سائیکل ٹھیک ہو گئی تو اس لڑکے کے نوکر کے حوالے کر دی اور کہا۔ "دیکھو! بابو جی سے مت کہنا کہ میں نے ٹھیک کی ہے۔"

اس لڑکے کی دوستی اسی دوران میں اپنے ایک ہم جماعت سے ہو گئی۔ تپش صاحب کو اس کا اتنا دکھ ہوا کہ نیم پاگل سے ہو گئے۔ داڑھی بڑھا لی سخت گرمیاں تھیں۔ مگر آپ اوورکوٹ پہنتے تھے۔ سر پر پانامہ ہیٹ اور چھینٹ کی نیکر کمر میں ـــــ پاؤں میں فل بوٹ ـــــ لیکن ان کی باتیں جب بھی غیر متوازن نہیں ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں انہوں نے اس لڑکے کے بارے میں بے شمار

شعر کہے، جو شعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ ان میں نیش صاحب کے دل کو جو ٹھیس پہنچی تھی، اس کا صاف پتہ چلتا ہے، ان میں درد ہے۔ کسک ہے اور افلاطونی عشق کی تمام گہرائیاں بھی موجود ہیں۔

یوں بھی نیش صاحب کو دنیوی معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن اس حادثے کے بعد وہ بالکل بے نیاز ہو گئے، کھانا ملا ہے، تو کھا لیا، نہیں ملا تو کوئی پرواہ نہیں۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہم لاہور کے حاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ نیش صاحب کھانا کھا چکے تھے، لیکن مجھے کھانا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں ان کے چند دوست آئے جو پاس والے میز پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے نیش صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا "آئیے، کھانا تناول فرمائیے"۔

نیش صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ "خدا آپ کو بہت بہت دے۔ میں گھر سے کھا کر آیا ہوں"۔

ان کے دوست نے بڑا اصرار کیا کہ وہ ضرور کھائیں۔ آخر تنگ آکر وہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور بارہ روٹیاں اور سالن کی دو پلیٹیں منگوائیں۔ اس کے بعد فرنی کی چار پلیٹیں کھائیں اور خدا کا شکر ادا کر کے وہاں سے اٹھے اور میرے پاس چلے آئے ـــــ ان کے اس دوست کی حالت قابلِ رحم تھی جس نے از راہِ

تکلف ان کو دعوت دی تھی۔ وہ بالکل مبہوت تھا، وہ شاید اس لمحے پر لعنتیں در لعنتیں بھیج رہا تھا۔ جب اس نے تپش صاحب سے کہا۔ "آیئے کھانا تناول فرمایئے۔"

میرا خیال ہے کہ تپش صاحب میں ذائقے کی حس موجود نہیں تھی، وہ ہر چیز کھا سکتے تھے۔ تھوہر اور کیلے میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا۔ کچے چاول ہوں یا ابلے ہوئے، روٹی تازہ ہو یا پانچ چھ روز کی باسی، ان کے لئے ایک جیسی تھی۔

میں نے کبھی ان کو کسی چیز کے بارے میں شکایت کرتے نہیں سنا۔ جو مل جائے ٹھیک ہے —— لیکن حیرت ہے کہ اس قسم کی طبیعت کا مالک جو فالودے میں کھیر، نمکین چائے اور نیلوفر کا شربت ملا کر پی جاتا ہو، تمام سبزیاں پتوں اور ڈنٹھلوں سمیت کھاتا ہو، ایک ایک پاؤ سرخ مرچ پھانک جاتا ہو، اپنی صحت کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔

ان کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی، سرخ رنگت، سر کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں سات آٹھ برس بڑے تھے۔ یعنی چھیالیس سنتالیس برس کے لگ بھگ، مگر ان کے مقابلے میں، میں بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ میرے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ تپش صاحب کو عورتوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ

صنفِ نازک سے صنفِ کرخت کو کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ شیشے کا رشتہ پتھر سے غیر فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو جس کو انہوں نے کبھی گھر میں بسایا ہی نہیں تھا۔ آخر طلاق دے کر آزاد کر دیا۔

جب میرے بلانے پر بمبئی آئے تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر آئے تھے۔ مجھ سے انہوں نے اس بات کا ذکر بہت دیر بعد میں کیا۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن اس کا ردِ عمل ان پر اس صورت میں نمودار ہوا کہ انہوں نے باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔ مگر ان کی تلاوت کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔

میں نے ایک روز دیکھا کہ وہ صبح سویرے اٹھے، غسل کیا اور الف ننگے بدن خشک کئے بغیر کرسی پر بیٹھ گئے۔ حمائل شریف نکالی اور تلاوت شروع کر دی۔ ایک پارہ پڑھا۔ کپڑے پہنے اور باہر نکلے، میں حیرت میں گم تھا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے ـــــ کہیں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ لیکن میرا شک غلط ثابت ہوا۔ باہر نکل کر انہوں نے ٹرام کے ایک ٹکٹ پر نظم کہی۔ مجھ سے بڑی پر مغز گفتگو کی۔ میری زبان کی چند غلطیوں کی طرف میری توجہ دلائی۔ میرے دماغ میں چونکہ بڑی کھد بد ہو رہی تھی اس لئے میں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "پیش صاحب ـــــ آپ ننگے ـــــ ننگے بدن قرآن مجید کی تلاوت کیوں

کرتے ہیں ـــــ کیا یہ معیوب نہیں؟"

تیش صاحب مسکرائے۔ "قرآن میں کہیں بھی یہ حکم صادر نہیں کیا گیا کہ آدمی تینوں کپڑے پہن کر اس کی تلاوت کرے ـــــ میں اس لئے کپڑے نہیں پہنتا کہ مبادا ان میں گندگی کی الائش ہو ـــــ نہانے کے بعد میں تولیئے سے اپنا بدن بھی اس لئے خشک نہیں کرتا۔"

عجب منطق تھی۔ بہرحال میں خاموش رہا۔ کیونکہ ان سے بات کرنا ایک اچھی خاصی طویل بحث کا آغاز کرنا تھا۔

اسی دوران میں انہیں تپ محرقہ ہوگیا ـــــ میں نے ڈاکٹر بلایا ـــــ سولہ روپے اس کی فیس ادا کی مگر تیش صاحب نے اس ڈاکٹر سے بڑے کرخت لہجے میں کہا۔ "صاحب آپ کو یہاں کس نے بلایا ہے ـــــ مجھے معلوم ہے کہ میرا عارضہ کیا ہے اور مجھے اس کا علاج بھی معلوم ہے۔ آپ تشریف لے جائیے۔"

ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے۔ تیش صاحب نے اکیس دن فاقہ کشی کی، کچھ کھایا نہ پیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا "میں اب بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں ـــــ نوکر کو چوپاٹی بھیجو اور آٹھ آنے کا رگڑا منگواؤ ـــــ ڈھیر ساری مرچیں ہوں ـــــ"

رگڑا ممبئی کی زبان میں چاٹ کو کہتے ہیں، یعنی آلو چھولے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ خوفناک چیزیں منگواؤں یا نہ منگواؤں۔ مگر تپش صاحب کے آگے کیا پیش چل سکتی تھی، آخر میں نے نوکر کو چوپاٹی بھیجا اور رگڑا منگوایا جو تپش صاحب نے سب کا سب کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں اتنی مرچیں اور اتنی کھٹائی تھی جو بیس بائیس آدمیوں کو بھی پیچش یا اسہال معدہ کے امراض میں گرفتار کر دیتیں ـــــ لیکن تعجب ہے کہ دوسرے روز وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں تپ محرقہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا ـــــ میں نے جب اپنی حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھ سے کہا: "برادرم ـــــ ہر بیماری کے لئے علاج ہوتے ہیں ـــــ ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنے مرض کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم ہی سے کرائے ـــــ خدا نے ہر آدمی کو اپنے عوارض دور کرنے کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے ـــــ وہ اگر اس سے کام لے تو ڈاکٹروں اور طبیبوں کی ضرورت ہی نہیں۔"

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ ان کا رنگ جو کسی پیلا ہو گیا تھا چند روز میں رگڑا کھا کھا کر پھر وہی سرخی اختیار کر گیا۔ آپ نے پھر اسی طرح ہر روز نظمیں اور غزلیں کہنا شروع کر دیں ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوئے۔

بہت دن گذر گئے ـــــ میرا مطلب ہے قریب قریب ڈھائی

مہینے کا عرصہ بیت گیا۔ اس کے بعد ایک دن اچانک تپش صاحب نے مجھ سے کہا۔ "میں آپ کے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"کسی دوست کو زیادہ دیر تک تکلیف دینا نہیں چاہیئے۔"

میں نے ان سے کہا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں ـــــ آپ محض تکلف کر رہے ہیں۔"

تپش صاحب جس بات کا تہیہ کر لیں، بالآخر وہ پوری ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنا چھوٹا سا ٹین کا بکس اٹھا کر میرے گھر سے چلے گئے ـــــ معلوم نہیں کہاں۔

اگر انہوں نے اپنے ٹھکانے کے متعلق مجھے کچھ بتایا ہوتا تو میں یقیناً ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور جاتا ـــــ مگر وہ اس افراتفری میں گئے کہ میں ان سے پوچھ بھی نہ سکا۔ ایک دن وہ خود آئے خلاف معمول نیا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بالوں میں تیل بھی تھا۔ مجھ سے ملتے ہی کہنے لگے۔

ـــــ "برادرم ـــــ مجھے عشق ہو گیا تھا دراصل۔"

میں چکرا گیا ـــــ تپش صاحب اور عشق؟ ـــــ کیا اس لاہور ہی کے لڑکے کا کوئی نعم البدل بمبئی میں پیدا ہو گیا ہے؟

تپش صاحب نے مجھے زیادہ دیر تذبذب میں نہ رکھا اور اپنے عشق کی

روداد سنادی۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ انہیں ایک لڑکی سے عشق ہوا تھا۔

یہ لڑکی ایک مجاور کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں مرچکی تھی۔ تپش صاحب وکٹوریہ گارڈن میں اس کو اپنے ساتھ لاتے اور مجھے مجبور کیا کہ اس کا فوٹو اتارا جائے۔ چنانچہ ان کے احکام کے مطابق میں اپنے ایک دوست سے کیمرہ لے کر پہنچا۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ بڑی الہڑ قسم کی۔ تپش صاحب سے بہت جھینپتی تھی۔ اس سے زیادہ مجھ سے ——— اور اس سے بھی زیادہ اردگرد کے ماحول سے۔

خیر میں نے چار پانچ پوز لئے اور وکٹوریہ گارڈن میں ان دونوں کو چھوڑ کر گھر چلا آیا ——— میرا دل و دماغ بہت مضطرب تھا۔ میرے قیاس میں کبھی یہ چیز آ ہی نہیں سکتی تھی کہ تپش کاشمیری صاحب کبھی کسی عورت سے دلچسپی لیں گے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ وہ اس لڑکی سے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، والہانہ محبت کرتے تھے۔

میں نے ایک روز ان سے کہا "تپش صاحب اتنی دیر ہوگئی ہے۔ آپ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے"

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں روپیہ جمع کر رہا تھا ——— اس کے باپ سے تمام باتوں کا فیصلہ ہو چکا ہے ——— میں نے اس کے بھائی کے لئے ایک سوٹ بنوا دیا ہے ——— باپ کو بھی کچھ روپے دے

چکا ہوں، اس لئے کہ اس کے پاس شادی کے اخراجات کے لئے کچھ بھی نہیں ——— ایک صوفہ سیٹ، ایک ڈریسنگ ٹیبل اور چار کرسیاں بھی خرید کر اس کے باپ کے حوالے کر دی ——— میں چاہتا ہوں ——— شادی کے بعد ان ہی کے ساتھ رہوں ——— وہ اداس نہیں ہوگی۔

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھا اور نیک خیال ہے"۔

تپش صاحب ذرا پھول سے گئے "میں حرام کاری کا قائل نہیں ——— اس سے باقاعدہ عقد کرنا چاہتا ہوں"۔

میں نے ان سے اس خدشے کا ذکر کیا جو اچانک میرے دماغ میں پیدا ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے ——— کوئی اور ——— میرا مطلب ہے کوئی اور آپ پر بازی نہ لے جائے"۔

تپش صاحب کے گال اور زیادہ سرخ ہو گئے "کون بازی لے جا سکتا ہے مجھ پر ——— میں شاعر ہوں لیکن اس کے علاوہ غنڈہ بھی ہوں۔ میں قلم کے علاوہ لٹھ سے بھی کام لینا جانتا ہوں"۔

تپش صاحب گھر بنانے کی فکر میں مصروف تھے کہ اس لڑکی کا معاشقہ ایک نوجوان پہلوان سے ہو گیا ——— اسی دوران لڑکی کے باپ کو ہیضہ ہوا اور وہ دو دن کے بعد راہیٔ ملکِ عدم ہوا

تپش صاحب نے اس کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔ بڑے احترام سے

اس کو دفن کیا ـــــ!

چوتھے روز انہیں معلوم ہوا کہ لڑکی اس نوجوان پہلوان کے ساتھ بھاگ گئی ہے ـــــ یہ انہیں عین اس وقت معلوم ہوا جب وہ کھیت والی اسٹریٹ سے نکلے تھے۔ تپش صاحب نے سائیکل کرائے پر لی اور اس موٹر کا تعاقب کیا جس میں پہلوان اس لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔

تپش صاحب نے ان کو پکڑ لیا ہوتا۔ مگر ان کی سائیکل ایک وکٹوریہ گاڑی کی جھپیٹ میں آگئی۔ آپ بہت بری طرح زخمی ہوئے۔ دائیں کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ـــــ دوستوں نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ چوٹ اتنی اثر انداز ہوئی کہ وہ کئی دن بیہوش رہے ـــــ ان کا بازو پلاسٹک میں باندھا ہوا تھا۔ ہلنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ پر جب انہیں ذرا سا ہوش آیا تو انہوں نے یہ ٹھانی کہ ہسپتال سے کسی نہ کسی طریقے سے باہر نکلنا چاہیے۔ جنرل وارڈ میں تھے۔ جب دیکھا کہ ڈاکٹر کھانا کھانے گئے ہیں تو وارڈ سے نکل آئے اور سیدھے میرے پاس آئے اور کہا۔ "مجھ سے فضول باتیں مت پوچھنا ـــــ"

میں نے ان سے کوئی فضول بات نہ پوچھی ـــــ لیکن ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "میں اب کیا کروں؟"

اب اس کا میرے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا ـــــ میں نے صرف

اتنا کہا۔ "تپش صاحب آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں ـــــ میں تو کم عقل ہوں۔"

تپش صاحب میرا یہ جواب سن کر چند لمحات خاموش رہے۔ اس کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے ـــــ ہر شخص اپنے معاملات اچھی طرح جانتا ہے۔"

دوسرے دن انہوں نے زنانہ لباس پہننا شروع کر دیا ـــ وہی کپڑے تھے جو انہوں نے اس لڑکی کے لئے بنوائے تھے۔

رشوت

احمد دین اچھے کھاتے پیتے آدمی کا لڑکا تھا ـــــ اپنے ہم عمر لڑکوں میں سب سے زیادہ خوش پوش مانا جاتا تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بالکل خستہ حال ہو گیا۔

اس نے بی۔ اے کیا اور اچھی پوزیشن حاصل کی۔ وہ بہت خوش تھا ـــــ اس کے والد خان بہادر عطاء اللہ کا ارادہ تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجیں گے۔ پاسپورٹ لے لیا گیا تھا، سوٹ وغیرہ بھی بنوا لئے گئے تھے کہ اچانک خان بہادر عطاء اللہ نے جو بہت شریف آدمی تھے کسی دوست کے کہنے پر سٹہ کھیلنا شروع کر دیا۔

شروع میں انہیں اس کھیل میں کافی منافع ہوا۔ وہ خوش تھے ـــ

کہ چلو میرے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ ہی نکل آیا۔ مگر لالچ بری بلا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی پشت پر چوگنی ہے ـــــ جتنے ہی چلے جائیں گے۔ ان کا وہ دوست جس نے ان کو اس راستے پر لگایا تھا، بار بار ان سے کہتا تھا۔ "خانصاحب! ماشاء اللہ آپ قسمت کے دھنی ہیں ـــــ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالیں تو سونا بن جائے۔"

اور وہ اس قسم کی چاپلوسیوں کے ذریعے خان بہادر سے سو دو سو روپے اینٹھ لیتا۔ خان بہادر کو بھی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ اس لئے کہ انہیں بغیر محنت ہزاروں روپے مل رہے تھے۔

احمد دین ذہین اور باشعور لڑکا تھا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے کہا۔ "ابا جی، یہ آپ نے جو سٹہ بازی شروع کی ہے، معاف کیجئے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

خان بہادر نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔ "برخوردار تمہیں میرے کاموں میں دخل دینے کی جرأت نہیں ہونی چاہیئے ـــــ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے ـــــ جتنا روپیہ آ رہا ہے وہ میں اپنے ساتھ قبر میں لے کر نہیں جاؤں گا ـــــ یہ سب تمہارے کام آئے گا۔"

احمد دین نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "لیکن ابا جی، یہ کب تک آتا رہے گا ـــــ ہو سکتا ہے، کل کو جانے بھی لگے۔"

خاں بہادر بھنّا گئے۔ "بکومت ـــــ آتا ہی رہے گا"۔

روپیہ آتا رہا ـــــ لیکن ایک روز خان بہادر نے کئی ہزار روپے کی رقم داؤ پر لگادی ـــــ نتیجہ صفر نکلا ـــــ دس ہزار ہاتھ سے دینے پڑے۔

"تاؤ" میں آکر انہوں نے بیس ہزار کا سٹہ کھیلا ـــــ ان کو یقین تھا کہ ساری کسر پوری ہو جائیگی ـــــ لیکن صبح جب انہوں نے اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بیس ہزار بھی گئے۔

خان بہادر ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنا ایک مکان گرو رکھ کر پچاس ہزار روپے لئے اور سب کے سب اللہ کا نام لے کر چاندی کے سٹے پر لگا دیئے۔

اللہ کا نام تو خیر اللہ کا نام ہے ـــــ وہ چاندی اور سونے کی مارکیٹ پر کیا کنٹرول کر سکتا ہے ـــــ صبح ہوئی تو خان بہادر کو معلوم ہوا کہ چاندی کا بھاؤ ایک دم گر گیا ہے ـــــ ان کو اسقدر صدمہ ہوا کہ دل کے دورے پڑنے لگے۔

احمد دین نے ان سے کہا "ابا جی ـــــ چھوڑ دیجئے اس بکواس کو ـــــ"

خان بہادر نے بڑے غصّے میں اپنے بیٹے سے کہا ـــ "تم بکواس

مت کرو ـــــ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔"

احمد دین نے مؤدبانہ کہا۔ "لیکن ابا جان، یہ جو آپ کو دل کی تکلیف شروع ہو گئی ہے ـــــ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم ـــــ اللہ بہتر جانتا ہے ـــــ ایسے عارضے انسان کو ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

احمد دین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "جی ہاں ـــــ انسان کو ہر قسم کے عارضے ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے ـــــ مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی چیز کھالیں جس میں ہیضے کے جراثیم ہوں ـــــ اور ـــــ"

خان بہادر کو اپنے بیٹے کی یہ گفتگو پسند نہیں تھی۔ "تم چلے جاؤ یہاں سے ـــــ میرا مغز مت چاٹو ـــــ میں ہر چیز سے واقف ہوں ـــــ"

احمد دین نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کی غلط فہمی ہے ـــــ کوئی انسان بھی ہر چیز سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

احمد دین چلا گیا۔ خان بہادر اندرونی طور پر خود کو بہت بڑا چغد سمجھنے لگے تھے، لیکن وہ اپنے اس احساس کو اپنے لڑکے پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

——— بستر پر لیٹے انہوں نے بار بار خود سے کہا "خان بہادر عطا محمد ——— تم خان بہادر بنے پھرتے ہو ——— لیکن اصل میں تم اول درجے کے بیوقوف ہو"۔

"تم اپنے بیٹے کی بات پر کان کیوں نہیں دھرتے، جبکہ تم جانتے ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح ہے"۔

"جتنا روپیہ تم نے حاصل کیا تھا، اس سے دوگنا زیادہ تم ضائع کر چکے ہو ——— کیا یہ درست ہے؟"

خان بہادر جھنجلا گئے اور بڑبڑانے لگے۔ "سب درست ہے۔ سب درست ہے ——— ایک میں ہی غلط ہوں ——— لیکن میرا غلط ہونا ہی صحیح ہوگا ——— بعض اوقات غلطیاں بھی صحت کا سامان مہیا کر دیتی ہیں ———"

پندرہ دن بستر پر لیٹے اور علاج کرانے کے بعد جب وہ کسی قدر تندرست ہوئے تو انہوں نے اپنا ایک مکان اور بیچ دیا۔ یہ پچیس ہزار میں بکا ——— خانصاحب نے یہ سب روپے سٹے پر لگا دیئے۔ ان کو پوری پوری امید تھی کہ وہ اپنی اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر لیں گے، مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور وہ ان پچیس ہزار روپوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

احمد دین بیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے

والد کو کس طرح سمجھاتے، وہ اس کی کوئی بات سننے ہی نہیں تھے۔

احمد دین نے آخری کوشش کی اور ایک دن جب اس کا باپ اپنے کمرے میں حقہ پی رہا تھا اور معلوم نہیں کس سوچ میں غرق تھا کہ وہ اس سے ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوا۔" اباجی!"

خان بہادر صاحب سوچ میں اس قدر غرق تھے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی آواز ہی نہ سنی

احمد دین نے آواز کو ذرا بلند کیا۔" اباجی ——— اباجی ——"

خان بہادر چونکے "کیا ہے؟"

احمد دین کانپ گیا۔" کچھ نہیں اباجی ——— مجھے ——— مجھے آپ سے ایک بات کہنا تھی۔"

خان بہادر نے حقے کی نڑی اپنے منہ سے جدا کی۔" کہو، کیا کہتا ہے؟"

احمد دین نے بڑی لجاجت سے کہا۔" مجھے یہ عرض کرنا تھا ——— آپ سے یہ درخواست کرنا تھی ——— کہ ——— آپ سٹہ کھیلنا بند کر دیں۔"

حقے کا ایک زور کا کش لے کر وہ احمد دین پر برس پڑے۔" تم کون ہو، مجھے نصیحت کرنے والے ——— میں جانوں میرا کام ——— کیا اب تک تمہارے ہی مشورے سے میں سارے کام کرتا رہا ہوں ———

دیکھو، میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ میرے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا ——— مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں ——— سمجھے"۔

احمد دین کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ "جی میں سمجھ گیا" اور یہ کہہ کر وہ اپنے باپ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سٹے کی لت شراب کی عادت سے بھی کہیں بری ہوتی ہے ——— خان بہادر اس میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے کہ جو جائیداد تھی سب کی سب اس خطرناک کھیل کی نذر ہو گئی ——— مرحوم بیوی کے زیور تھے، وہ بھی گئے ——— اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے دل کے عارضے نے کچھ ایسی شکل اختیار کی کہ وہ ایک روز صبح سویرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی دھم سے گرے اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر دم توڑ دیا۔

احمد دین کو ظاہر ہے کہ اپنے باپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا ——— وہ کئی دن نڈھال رہا ——— اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ ——— بی۔ اے پاس تھا ——— اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا ——— مگر اب سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے باپ نے ایک چھوٹی کوڑی بھی اس کے لئے نہیں چھوڑی تھی ——— مکان جس میں وہ تن تنہا رہتا تھا ——— رہن تھا۔

یہاں سے اس کو کچھ عرصے کے بعد نکلنا پڑا۔ گھر کی مختلف چیزیں

بیچ کر اس نے چار پانچ سو روپے حاصل کئے اور ایک غلیظ محلے میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔

مگر پانچ سو روپے کب تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک برس تک بڑی کفایت شعاری سے گزارہ کر لیتا ——— لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟

احمد دین نے سوچا۔ مجھے ملازمت کر لینی چاہیے ——— چاہے وہ کیسی بھی ہو ——— پچاس ساٹھ روپے ماہوار مل جائیں، تو گذران ہو جائے گا۔"

اس کی ماں کو مرے اتنے ہی برس ہو گئے تھے، جتنے اس کو جیتے، احمد دین نے حالانکہ اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، نہ اس کو اس کا دودھ پینا نصیب ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اکثر اس کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا۔

احمد دین نے ملازمت حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی ——— اتنے بے روزگار اور بے کار آدمی تھے کہ وہ خود کو اس بے روزگاری اور بے کاری کے سمندر میں ایک سمجھتا تھا ——— لیکن اس احساس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنی تگ و دو جاری رکھی۔

بہت دنوں کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اگر کسی افسر کی مٹھی گرم کی جائے

تو ملازمت ملنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ مٹھی گرم کرنے کا مسالہ کہاں سے لاتا۔

ایک دفتر میں جب وہ ملازمت کے سلسلے میں گیا، تو ہیڈ کلرک نے اس سے شفیقانہ انداز میں کہا "دیکھو برخوردار، یوں خالی خولی کام نہیں چلے گا ——— جس آسامی کے لئے تم نے درخواست دی ہے اس کے لئے پہلے ہی دو سو پچاس درخواستیں وصول ہو چکی ہیں ——— میں بڑا صاف گو آدمی ہوں ——— پانچ سو روپے اگر تم دے سکتے ہو تو یہ ملازمت تمہیں یقیناً مل جائے گی"۔

اب احمد دین پانچ سو روپے کہاں سے لاتا۔ اس کے پاس بمشکل بیس بائیس روپے تھے۔ چنانچہ اس نے ہیڈ کلرک سے کہا۔ "جناب میرے پاس اتنے روپے نہیں ——— آپ ملازمت دلوا دیجئے تنخواہ میں سے آدھی رقم آپ لے لیا کریں"۔

ہیڈ کلرک ہنسا۔ "تم ہمیں بیوقوف بناتے ہو ——— جاؤ چلتے پھرتے بنو"۔

احمد دین بہت دیر تک چلتا پھرتا رہا۔ مگر اسے اطمینان سے کہیں بیٹھنے کا موقعہ نہ ملا ——— جہاں جاتا رشوت کا سوال سامنے ہوتا۔ اس نے سوچا شاید یہ کائنات رشوت ہی کی وجہ سے عالمِ وجود میں آئی ہے۔ شاید

خدا کو کسی نے رشوت دی ہو اور اس نے یہ دنیا بنا دی ہو۔

احمد دین کے پاس جب ایک پیسہ بھی نہ رہا تو اس نے مزدوری شروع کر دی، بوجھ اٹھاتا اور ہر روز ایک دو روپے کما لیتا ـــــ مہنگائی کا زمانہ تھا۔ گو دونوں وقت کا کھانا بھٹیار خانے میں کھاتا، لیکن اسے کافی خرچ برداشت کرنا پڑتا ـــــ زیادہ سے زیادہ ایک آنہ بچ رہتا۔

احمد دین مزدوری کرتا مگر اس کے دل و دماغ پر رشوت کا چکر گھومتا رہتا تھا ـــــ یہ ایک بہت بڑی لعنت تھی، وہ چاہتا تھا کہ اس سے کسی طرح نجات حاصل کرے ـــــ اور مزدوری چھوڑ کر کوئی ایسی ملازمت اختیار کرے جو اس کے شایانِ شان ہو ـــــ آخر وہ بی۔ اے پاس تھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔

اس نے سوچا کہ نماز پڑھنا شروع کر دے ـــــ خدا سے دعا مانگے کہ وہ اس کی سنے، چنانچہ اس نے باقاعدہ پانچ وقت کی نماز شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ایک برس تک جاری رہا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اس دوران میں اس کے پاس تیس روپے جمع ہو چکے تھے۔ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ڈاک خانے گیا۔ تیس روپے کا پوسٹل آرڈر لیا اور لفافے میں ڈال کر ساتھ ہی ایک رقعہ بھی رکھ دیا جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"اللہ میاں ـــــ میں سمجھتا ہوں، تم بھی رشوت لے کر کام کرتے ہو ـــــ میرے پاس تیس روپے ہیں جو تمہیں بھیج رہا ہوں ـــــ مجھے کہیں اچھی سی ملازمت دلوا دو ـــــ بوجھ اٹھا اٹھا کر میری کمر دوہری ہوگئی ہے۔"

لفافے پر اس نے پتہ لکھا۔ "بخدمت جناب اللہ میاں ـــــ مالکِ کائنات۔"

چند روز کے بعد احمد دین کو ایک خط جو کائنات اخبار کے ایڈیٹر کی طرف سے تھا۔ اس کا نام محمد میاں تھا۔ خط کے ذریعے اس نے احمد دین کو بلایا تھا

وہ کائنات کے دفتر گیا، جہاں اس کو مترجم کی حیثیت سے سو روپیہ ماہوار پر رکھ لیا گیا ـــــ احمد دین نے سوچا ـــــ آخر رشوت کام آ ہی گئی۔

قیمے کی بجائے بوٹیاں

ڈاکٹر سعید میرا ہمسایہ تھا، اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ اس کی گراؤنڈ فلور پر اس کا مطب تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا۔ ایک دو گھنٹے کی تفریح ہو جاتی۔ بڑا بذلہ سنج، ادب شناس اور وضعدار آدمی تھا۔

رہنے والا بنگلور کا تھا۔ مگر بڑی شستہ وارفتہ اردو میں گفتگو کرتا تھا۔ اس نے اردو کے قریب قریب تمام بڑے بڑے شعراء کا مطالعہ کچھ ایسے ہی انہماک سے کیا تھا جس طرح اس نے ایم بی بی ایس کورس کی جملہ کتابوں کا۔

میں کئی دفعہ سوچتا کہ ڈاکٹر سعید کو ڈاکٹر بننے کے بجائے کسی بھی مضمون میں ایم اے، ایچ پی کی ڈگری حاصل کرنی چاہیے تھے۔ اس لئے کہ اس کی

افتادِ طبع کے لئے یہ نہایت موزوں و مناسب ہوتی۔ چنانچہ میں نے ایک روز اس سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ نے یہ پروفیشن کیوں اختیار کیا؟"

"کیوں؟"

میں نے ان سے کہا۔ "آپ اردو فارسی زبان کے بڑے اچھے پروفیسر ہوتے ——— بڑے ہر دلعزیز ——— طالب علم آپ کے گرویدہ ہوتے۔"

وہ مسکرایا۔ "ایک ہی بات ہوتی ——— نہیں ——— زمین و آسمان کا فرق ہوتا ——— میں یہاں اپنے مطب میں بڑے اطمینان سے بیٹھا ہر روز کم از کم سوا سو روپے بنا لیتا ہوں ——— اگر میں نے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کیا ہوتا تو مجھے کیا ملتا؟ ——— زیادہ سے زیادہ چھ سات سو روپے ماہوار!"

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "بڑی معقول آمدنی ہے۔"

"آپ اسے معقول کہتے ہیں ——— سو روپے کے قریب تو میرا اپنا جیب خرچ ہے ——— آپ جانتے ہی ہیں کہ میں شراب پینے کا عادی ہوں اور وہ بھی ہر روز ——— قریب قریب پچھتر روپے تو اسی مد پر اٹھ جاتے ہیں ——— پھر سگریٹ ہیں، دوست یاروں کی تواضع ہے

—— یہ سب خرچ کیا ایک لیکچرر، پروفیسر، ریڈر یا پرنسپل کی تنخواہ پورا کر سکتی ہے ——"

میں قائل ہو گیا۔ "جی نہیں —— آپ ڈاکٹر نہ ہوتے، ادیب ہوتے، مصوّر ہوتے ——"

میری بات کاٹ کر انہوں نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "اور فاقہ کشی کرتا۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

ڈاکٹر سعید کے اخراجات واقعی بہت زیادہ تھے، اس لئے کہ وہ کنجوس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے مطب سے فارغ ہو کر فرصت کے اوقات میں دوستوں، یاروں کی محفلیں جمانے میں ایک خاص قسم کی مسرّت حاصل ہوتی تھی۔

شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی بنگلور ہی کی تھی۔ جس کے بطن سے دو بچے تھے ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ اس کی بیوی اردو زبان سے قطعاً ناآشنا تھی اس لئے اسے تنہائی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی، کبھی کبھی چھوٹی لڑکی آتی اور اپنی ماں کا پیغام ڈاکٹر کے کان میں ہولے سے پہنچا دیتی اور پھر دوڑتی ہوئی مطب سے باہر نکل جاتی۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر سے میرا دوستانہ ہو گیا —— بڑا بے تکلف قسم کا۔ اس نے مجھے اپنی گذشتہ زندگی کے تمام حالات و

واقعات سنائے۔ مگر وہ اتنے دلچسپ نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے۔

اب میں نے باقاعدگی کے ساتھ ان کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ میں بھی چونکہ بوتل کا رسیا تھا اس ہم دونوں کی گاڑھی چھننے لگی۔

ایک دو ماہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر سعید اُلجھا اُلجھا سا رہتا ہے۔ اپنے کام سے اس کی دلچسپی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ پہلے تو میں اُسے ٹٹولتا رہا، آخر میں نے صاف لفظوں میں اس سے پوچھا۔ "یار سعید ــــ تم آج کئی دن سے کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟"

ڈاکٹر سعید کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"نہیں تو۔"

"نہیں تو کیا ــــ میں اتنا گدھا تو نہیں کہ اتنا بھی نہ پہچان سکوں کہ تم کسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار ہو۔"

ڈاکٹر سعید نے اپنا وہسکی کا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں تک لے جا کر کہا۔

"محض تمہارا واہمہ ہے ــــ یا تم اپنی نفسیات شناسی کا رعب مجھ پر گانٹھنا چاہتے ہو۔"

میں نے ہتھیار ڈال دیئے ــــ حالانکہ اس کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کے دل کا چور پکڑا جا چکا ہے، مگر اسے اپنی شکست کے اعتراف کا حوصلہ نہیں۔

بہت دن گذر گئے۔ اب وہ کئی کئی گھنٹے اپنے مطب سے غیر حاضر

رہنے لگا۔ یہ جاننے میں کہ وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، اس کی ذہنی پریشانی کا باعث کیا ہے۔ میرے دل و دماغ میں بڑی کھد بد ہو رہی تھی۔ اب اتفاقاً اگر اس سے ملاقات ہوتی تو میرا بے اختیار جی چاہتا کہ اس سے ایک بار پھر وہ سوالات کروں جن کے جواب سے میری ذہنی الجھن دور ہو اور ڈاکٹر سعید کے عقب میں جو کچھ بھی تھا۔ اس کی صحیح تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجائے ـــــ مگر ایسا کوئی تخلیے کا موقعہ نہ ملا۔

ایک دن شام کو جب میں اس کے مطب میں داخل ہونے لگا تو اس کے نوکر نے مجھے روکا۔ "صاحب ابھی اندر نہ جائیے، ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے ہیں۔"

"تو دیکھا کریں۔"

نوکر نے مؤدبانہ عرض کی "صاحب ـــــ وہ ـــــ میرا مطلب ہے، مریض عورت ہے۔"

"اوہ ـــــ کب تک فارغ ہو جائیں گے، اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

نوکر نے جواب دیا۔ جی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــ ایک گھنٹے سے وہ بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے ہیں۔"

میں تھوڑے توقف کے بعد مسکرایا۔ "تو ـــــ تو مرض کوئی خاص

مرض معلوم ہوتا ہے۔" اور یہ کہہ کر میں نے غیر ارادی طور پر ڈاکٹر سعید کے کمرۂ تشخیص کا دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ سعید ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تپائی پر بیئر کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہیں اور دونوں محوِ گفتگو ہیں۔ سعید اور وہ مخترمہ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔

میں نے ازراہِ تکلف ان سے معذرت طلب کی اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سعید پکارا۔ "کہاں چلے ـــــ بیٹھو!"

میں نے سعید سے کہا۔ "میری موجودگی شاید آپ کی گفتگو میں مخل ہو۔"

سعید نے اٹھ کر مجھے کاندھوں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ "ہٹاؤ یار اس تکلف کو۔"

پھر اس نے ایک خالی گلاس میں میرے لئے بیئر انڈیلی اور اسے میرے سامنے رکھ دیا۔ "لو پیو۔"

میں نے دو گھونٹ بھرے تو سعید نے اس ادھیڑ عمر کی عورت سے جو لباس اور زیوروں سے کافی مالدار معلوم ہوتی تھی، تعارف کرایا۔ "سلمیٰ رحمانی۔ ـــــ اور یہ میرے عزیز دوست ـــــ سعادت حسن منٹو۔"

سلمیٰ رحمانی چند ساعتوں کے لئے مجھے بڑے غور اور تعجب سے دیکھتی رہی۔ "سعید ـــــ کیا واقعی یہ سعادت حسن منٹو ہیں جن کے افسانوں کے

سارے مجموعے میں بڑے غور سے ایک نہیں دو، دو تین تین مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔"

ڈاکٹر سعید نے اپنا گلاس اٹھایا۔" ہاں وہی ہیں ——— میں نے کئی مرتبہ خیال کیا کہ اس سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دوں، پر میں نے سوچا تم اس کے نام سے یقیناً واقف ہو گی ——— شیطان کو کون نہیں جانتا۔"

سلمیٰ رحمانی یہ سن کر پیٹ بھر کے ہنسی ——— اور اس کا پیٹ عام پیٹوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔

اس کے بعد مس سلمیٰ رحمانی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پڑھی لکھی عورت تھی۔ بڑے اچھے گھرانے سے متعلق تھی۔ تفتیش کرنے کے بغیر مجھے اس کے متعلق چند معلومات حاصل ہو گئیں کہ وہ تین خاوندوں سے طلاق لے چکی ہے۔ صاحبِ اولاد ہے۔ جہاں رہتی ہے اس میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک غسل خانہ ہے، وہاں اکیلی رہتی ہے۔ غیر منقولہ جائیداد سے اس کی آمدنی چار پانچ سو روپے ماہوار کے قریب ہے۔ ہیرے کی انگوٹھیاں پہنتی ہے۔

ان انگوٹھیوں میں سے ایک میں نے دوسرے روز شام کو سعید کی انگلی میں دیکھی۔

تیسرے روز کو ڈاکٹر سعید کے مطب میں سلمیٰ رحمانی موجود تھی۔ دونوں بہت خوش تھے اور چہچہا رہے تھے ـــــ میں بھی ان کی بیئر نوشی میں شریک ہوگیا۔

پچھلے ایک ہفتے سے میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر سعید کے اندر کرۂ تشخیص سے کچھ دور جو کمرے خالی پڑے رہتے تھے اُن کی بڑی توجہ سے مرمت کرائی جا رہی ہے۔ ان کو سجایا بنایا جا رہا ہے۔ فرنیچر جب لایا گیا تو وہی تھا جو میں نے سلمیٰ رحمانی کے گھر دیکھا تھا۔

اتوار کو ڈاکٹر سعید کی چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ کواڑ بند رہتے، تاکہ اس کو تنگ نہ کیا جائے ـــــ مجھے تو وہاں ہر وقت آنے جانے کی اجازت تھی۔ ایک چور دروازہ تھا، اس کے ذریعے سے میں اندر پہنچا اور سیدھا اُن دو کمروں کا رُخ کیا، جن کی مرمت کرائی گئی تھی۔

دروازہ کھلا تھا، میں اندر داخل ہوا تو حسبِ توقع ڈاکٹر سعید کی بغل میں سلمیٰ رحمانی بیٹھی تھی۔ سعید نے مجھ سے کہا۔ میری بیوی سلمیٰ رحمانی سے ملو۔

مجھے اس عورت سے کیا ملنا تھا۔ سینکڑوں بار مل چکا تھا، لیکن اگر کسی عورت کی چوتھویں شادی ہو تو اس کو کن الفاظ میں مبارکباد دینی چاہیے۔ اس کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں ـــــ

لیکن کہنا بھی کچھ ضرور تھا ——— اس لئے جو منہ میں آیا باہر نکال دیا۔
"تو آخر اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔"

میاں بیوی دونوں ہنسے۔ سعید نے مجھے بیٹھنے کو کہا، بیئر پیش کی۔ اور ہم شادی کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میں شام پانچ بجے آیا تھا۔ گھڑی دیکھی تو نو بجنے والے تھے۔ میں نے سعید سے کہا "لو بھئی ——— میں چلا ——— باتوں باتوں میں اتنی دیر ہو گئی ہے اس کا مجھے علم نہیں تھا۔"

سعید کے بجائے سلمیٰ رحمانی، معاف کیجئے گا سلمیٰ سعید مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "نہیں آپ نہیں جا سکتے ——— کھانا تیار ہے ——— اگر آپ کہیں تو لگوا دیا جائے۔"

خیر، سعید اور اس کی نئی بیوی کے پیہم اصرار پہ مجھے کھانا، کھانا پڑا، جو بہت خوش ذائقہ اور لذیذ تھا۔

دو برس تک ان کی زندگی بڑی ہموار گزرتی رہی۔ ایک دن میں ناسازیٔ طبیعت کے باعث بستر ہی میں لیٹا تھا کہ نوکر نے اطلاع دی۔ "ڈاکٹر سعید صاحب تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جاؤ ان کو اندر بھیج دو۔"

سعید آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مضطرب اور پریشان ہے۔

اس نے مجھے کچھ پوچھنے کی زحمت نہ دی اور اپنے آپ بتا دیا کہ سلمیٰ سے اب اس کی ناچاقی شروع ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ وہ خود سرعورت ہے۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ میں نے صرف اس لئے اس سے شادی کر لی کہ وہ اکیلی تھی۔ اس کے عزیز و اقارب اسے پوچھتے ہی نہیں تھے ——— جب وہ بیمار ہوئی ——— اور یہ کوئی معمولی بیماری نہیں تھی۔ ڈیپتھیریا تھا جسے خناق کہتے ہیں۔ تو میں نے اپنا تمام کام چھوڑ کر اس کا علاج کیا اور خدا کے فضل و کرم سے وہ تندرست ہو گئی ——— پر اب وہ ان تمام باتوں کو پسِ پشت ڈال کر مجھ سے کچھ اس قسم کا سلوک کرتی ہے جو بے حد ناروا ہے۔"

"تو اغاز کا انجام شروع ہو گیا تھا۔"

چونکہ ڈاکٹر سعید کا گھر میرے گھر کے بالکل پاس تھا۔ اس لئے ان کی لڑائیوں کی اطلاعات ہمیں اکثر مختلف ذریعوں سے پہنچتی رہتی تھیں۔ سلمیٰ کے ساتھ دو نوکرانیاں تھیں، بڑی تیز طرار اور ہٹی کٹی ——— ان دونوں کے شوہر تھے، وہ ایک طرح اس کے ملازم تھے۔ اس کے اشارے پر جان دے دینے والے، اور ڈاکٹر سعید بڑا مختصر اور نحیف مرد

ایک دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سعید اور سلمیٰ نے پی رکھی تھی کہ آپس

میں دونوں کی چخ ہوگئی ——— ڈاکٹر نے معلوم نہیں نشے میں کیا کہا۔ کہ سلمیٰ آگ بگولہ ہوگئی۔ اس نے اپنی دونوں نوکرانیوں کو آواز دی وہ دوڑی دوڑی اندر آئیں۔ سلمیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کر دی جائے ——— ایسی مرمت کہ ساری عمر یاد رکھے۔

یہ حکم ملنا تھا کہ ڈاکٹر سعید کی مرمت شروع ہوگئی۔ دونوں نوکرانیوں نے اپنے شوہروں کو بھی اس سلسلے میں شامل کر لیا۔ لاٹھیوں گھونسوں اور دوسرے تھرڈ ڈگری طریقوں سے اسے خوب مارا پیٹا گیا۔ کہ اس کا کچومر نکل گیا۔ اُفتاں و خیزاں بھاگا وہاں سے اور اوپر اپنی پرانی بیوی کے پاس پہنچ گیا۔ جس نے ایک مستعد نرس کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اس نے دو کمروں کا رُخ قریب قریب دو ماہ تک نہ کیا۔ اب وہ سلمیٰ سے کسی قسم کا رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہو گیا، سو ہو گیا ——— اب اس کو اپنے گھر سے بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسے یہ محسوس ہوتا کہ یہ عورت جس سے میں نے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ کیوں ابھی تک اس کے سر پہ مسلط ہے ——— اس کے گھر سے چلی کیوں نہیں جاتی۔ مگر

وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک دو ماہ اور گذر گئے، پر اس دوران ڈاکٹر سعید کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا بیوی کے ایک تاجر سے معاشقہ چل رہا ہے۔ یہ شخص صرف نام ہی کا تاجر تھا۔ اس کے پاس کوئی دولت نہیں تھی۔ صرف ایک مکان تھا جو اس نے ہجرت کرنے کے بعد اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا۔

"دونوں ہر روز شام کو میرے یہاں آتے ——— شعر و شراب کی محفلیں جمتیں ——— اور میرے سینے پر مونگ دلتی رہتیں۔"

ایک دن اس سے یہ کہے بغیر نہ رہا جا سکا۔

میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے کہا۔ "اول تو تم نے یہ غلطی کی کہ سلمیٰ سے شادی کر لی ——— دوسری غلطی تم یہ کر رہے ہو کہ اسے اپنے گھر سے باہر نہیں کرتے ——— کیا یہ اس کے باپ کا گھر ہے؟"

ڈاکٹر سعید کی گردن شرمساری کے باعث جھک گئی۔ "یار چھوڑو اس قصے کو۔"

"قصے کو تو تم اور میں دونوں چھوڑنے کے لئے تیار ہیں ——— لیکن قصہ ہی تمہیں نہیں چھوڑتا اور نہ چھوڑے گا۔ جبکہ تم کوئی مردانہ کوشش نہیں کرتے۔"

وہ خاموش رہا ——— میں نے اس پر ایک گولہ اور پھینکا "سچ پوچھو تو سعید تم نامرد ہو ——— میں تمہاری جگہ ہوتا تو محترمہ کا قیمہ بنا ڈالتا ——— اصل میں تم ضرورت سے زیادہ شریف ہو"۔

سعید نے نقاہت بھری آواز میں صرف اتنا کہا۔ "میں بہت خطرناک مجرم بھی بن سکتا ہوں ——— تم نہیں جانتے"۔

میں نے طنزاً کہا۔ "سب جانتا ہوں ——— اس سے اتنی مار کھائی، اتنے ذلیل ہوئے ——— میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ محترمہ تمہارے گھر سے جاتی کیوں نہیں؟ ——— اس پر اب اس کا کیا حق ہے؟"

سعید نے جواب دیا۔ "وہ چلی گئی ہے ——— اور اس کا سامان بھی، بلکہ میرا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے"۔

میں بہت خوش ہوا، لعنت بھیجو اپنے سامان پر ——— چلی گئی ہے، بس ٹھیک ہے ——— تم خوش تمہارا خدا خوش ——— چلو اسی خوشی میں وہ دو بیئر کی یخ بستہ بوتلیں پئیں جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں ——— اس کے بعد کھانا کسی ہوٹل میں کھائیں گے"۔

سلمیٰ کے جانے کے بعد ڈاکٹر سعید کم از کم ایک ماہ تک کھویا کھویا سا رہا ——— اس کے بعد وہ اپنی نورمل حالت میں آگیا۔ ہر

شام اس سے ملاقات ہوتی۔ گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور ہنستے مذاق کرتے رہتے۔

کچھ دنوں سے میری طبیعت موسم کی تبدیلی کے باعث بہت مضمحل تھی۔ بستر میں لیٹا تھا کہ ڈاکٹر سعید کا ملازم آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں اور بلا رہے ہیں۔ ایک ضروری کام ہے۔"

میرا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ بستر پر سے اٹھوں ——— مگر میں سعید کو نا اُمید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے شیروانی پہن کر اس کے یہاں پہنچا۔ مکان کے باہر دیکھا کہ چار دیگیں چڑھی ہیں ——— قصائی دھڑا دھڑ بوٹیاں کاٹ کاٹ کر صحن کے ایک ٹکڑے پر پھینکے چلا جا رہا ہے۔

آس پاس کے کئی آدمی جمع تھے، میں سمجھا شاید کوئی نذر نیاز دی جا رہی ہے ——— میں نے گوشت کا وہ بڑا لوتھڑا دیکھا جس پر کلہاڑی چلائی جا رہی تھی ——— اس کے ساتھ دو باہیں تھیں ——— بالکل انسانوں کے مانند ——— میں نے پھر غور سے دیکھا ——— قصی طور پر انسانی باہیں تھیں۔ سمجھ میں نہ آیا، یہ قصہ کیا ہے۔

قصائی کی چھری اور کلہاڑی چل رہی تھی۔ چار دیگوں میں پیاز سُرخ

کی جا رہی تھی اور میرا دل و دماغ ان دونوں کے درمیان پھنستا اور دھنستا چلا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر سعید نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی پکارا۔

"آیئے ـــــ آیئے ـــــ آپ کے کہنے کے مطابق قیمہ تو نہ بن سکا، مگر یہ بوٹیاں تیار کرا لی گئی ہیں ـــــ ابھی اچھی طرح بھونی نہیں گئیں، ورنہ میں آپ کو ایک بوٹی پیش کرتا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مرچ مسالہ ٹھیک ہے یا نہیں"

"یہ سن کر پہلے مجھے متلی آئی ـــــ اور میں بیہوش ہو گیا۔

ختم شد